telenor
جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء
جلد نمبر ۱
شمارہ نمبر ۳
سہ ماہی
المنار
مجلس طلباے قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم　　نحمدہ و نُصلّی علیٰ رسولہ الکریم　　وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

جلد نمبر ۱ ۔ شمارہ نمبر ۳　　جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء

سہ ماہی
المنار
مجلس طلباے قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ

اس شمارہ میں

مضامین

شعر و سُخن

English Section

Front Cover : Railway bridge over the Chanab River in Rabwah
Back Cover: Railway bridge over the Chanab River in Rabwah

المنار یو۔ایس۔اے کا تیسرا شمارہ کچھ تاخیر کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ اُمید ہے کہ اہل ذوق کی تشنگی کم کرنے کا کچھ سامان فراہم کرے گا۔

تعلیم الاسلام کالج المنائی یو۔ایس۔اے سکالرشپ کا نظارت تعلیم صدر انجمن احمدیہ ربوہ کے تعاون اور حضور ایداللہ تعالیٰ کی منظوری کے بعد اجراء کا اعلان اس شمارہ کے آخری صفحات میں ملاحظہ کیجیے اور حسب استطاعت اپنے وعدہ جات سے مکرم اسلم پرویز صاحب، سیکرٹری مال کو جلد از جلد مطلع کریں اور حسب توفیق ادائیگی کی طرف توجہ فرمائیں۔

المنار کی اشاعت میں تواتر اور باقائدگی کے علاوہ اس کا معیار برقرار رکھنے کی خاطر مجلس ادارت کو لکھنے کا شغف رکھنے والوں کے تعاون کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے علمی اور ادبی مضامین، نثر اور منظوم کلام تواتر سے بھیجتے رہیے اور ہم اسے ان صفحات کی زینت بناتے رہیں گے۔

ہمیں آپ کی تحریروں اور آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

المنار کے لیے اپنی تحریریں ایڈیٹر کے نام بذریعہ ای میل درج ذیل پتہ پر ارسال کریں:
EditorAlmanar@gmail.com

ہاتھ سے تحریر شدہ مسودہ صفحہ کے ایک جانب سیاہ روشنائی میں تحریر کریں اور اگر ممکن ہو تو scan کر کے ای میل کر دیں یا درج ذیل پتہ پر ارسال کریں:

Al Manar USA
666 Gairloch Place
Bel Air, MD 21015
USA

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

ترجمہ: یہ (خرچ) ان ضرورت مندوں کی خاطر ہے جو خدا کی راہ میں محصور کر دیے گئے (اور) وہ زمین میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ایک لاعلم (ان کے) سوال سے بچنے (کی عادت) کی وجہ سے انہیں متمول سمجھتا ہے۔ (لیکن) تُو ان کے آثار سے ان کو پہچانتا ہے۔ وہ پیچھے پڑ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔ اور جو کچھ بھی تم مال میں سے خرچ کرو تو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

عَنْ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا حَسَدَ اِلَّا فِي ثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسُلِّطَ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا (صحیح بخاری)

عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: صرف دو ہی باتوں میں رشک کرنا جائز ہے۔ ایک وہ شخص جسے اللہ مال دے۔ پھر اس کو بر محل بے دریغ خرچ کرنے کی طاقت دے اور ایک وہ شخص جس کو اللہ نے حکمت دی تو وہ اس کے مطابق عمل کرتا ہو (اور فیصلے کرتا ہو) اور اوروں کو بھی سکھاتا ہو۔

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے اموال خرچ کرنا

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"خدا کی راہ میں جو لوگ مال خرچ کرتے ہیں ان کے مالوں میں خدا اس طرح برکت دیتا ہے کہ جیسے ایک دانہ جب بویا جاتا ہے تو گو وہ ایک ہی ہوتا ہے مگر خدا اُس میں سے سات خوشے نکال سکتا ہے اور ہر ایک خوشہ میں سو (۱۰۰) دانے پیدا کر سکتا ہے۔ یعنی اصل چیز سے زیادہ کر دینا یہ خدا کی قدرت میں داخل ہے اور در حقیقت ہم تمام لوگ خدا کی اس قدرت سے ہی زندہ ہیں اور اگر خدا اپنی طرف سے کسی چیز کو زیادہ کرنے پر قادر نہ ہوتا تو تمام دنیا ہلاک ہو جاتی اور ایک جاندار بھی روئے زمین پر باقی نہ رہتا"۔ (چشمہء معرفت صفحہ ۱۶۲)

حضرت مصلح موعودؓ اس بارہ میں لکھتے ہیں کہ:

"اگر تم دینی کاموں کے لیے اپنے اموال خرچ کروگے تو جس طرح ایک دانہ سے اللہ تعالیٰ سات سو دانے پیدا کر دیتا ہے اسی طرح تمہارے اموال کو بھی بڑھادے گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ترقی عطا فرمائے گا۔ جس کی طرف (وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ) میں اشارہ ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت ابو بکرؓ نے بے شک بڑی قربانیاں کی تھیں مگر خدا تعالیٰ نے ان کو اپنے رسول کا پہلا خلیفہ بنا کر انہیں جس انعام سے نوازا اُس کا مقابلہ میں اُن کی قربانیاں بھلا کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے بہت کچھ دیا مگر انہوں نے کتنا بڑا انعام پایا۔ حضرت عثمانؓ نے بھی جو کچھ خرچ کیا اس سے لاکھوں گُنا زیادہ انہوں نے اسی دُنیا میں پالیا۔۔۔ غرض اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربانی کرنے والا کبھی جزائے نیک سے محروم نہیں رہا"۔ (تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ۶۰۴)

کلام الامام

آں کہ در خُوبی ندارد ہمسرے

(حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام)

در دلم جوشد ثنائے سرورے
آں کہ در خوبی ندارد ہمسرے

آں کہ جانش عاشقِ یارِ ازل
آں کہ روحش واصلِ آں دلبرے

آں کہ مجذوبِ عنایات حق است
ہمچو طفلے پروریدہ دربرے

آں کہ در بِرّ و کرم بحرِ عظیم
آن کہ در لُطفِ اتم یکتا دُرے

آں کہ در جُود و سخا ابرِ بہار
آں کہ در فیض و عطا یک خاورے

آن رحیم و رحمِ حق را آیتے
آں کریم وجودِ حق را مظہرے

آں رُخِ فرّخ کہ دیدارِ او
زشت رو را میکند خوش منظرے

(المنار، جولائی تا ستمبر ۱۹۶۲ء)

تعلیم الاسلام کالج کی ناقابل فراموش یادیں اور کالجوں میں اس کا ایک امتیازی مقام

کبھی جو عہد گزشتہ کو لوٹ کر دیکھا

دل و نگاہ نے اس میں کیا کیا نہ رنگ بھرے

عبد الہادی ناصر

(سابق لیکچرار تعلیم الاسلام کالج ربوہ)

تعلیم الاسلام کالج وہ درسگاہ تھی جس کے لیے حضرت مسیح موعودؑ نے بیت الدعا میں خصوصی دعائیں کی تھیں۔ آپ چاہتے تھے کہ وہ خود جا کر اس کا افتتاح کریں مگر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے خود نہ جا سکے۔ البتہ آپ نے افتتاح کے موقع کے لیے ایک پیغام لکھ کر حضرت مولوی عبد الکریم صاحب کے ہاتھ بھجوایا جس کو اُنہوں نے پڑھ کر سنایا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی فرمایا کہ جب یہ پیغام پڑھا جا رہا ہو گا اُس وقت میں بیت الدعا میں دعا کر رہا ہوں گا۔

پھر یہ کالج حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیر سرپرستی پروان چڑھا۔ اور جلد یہ کالج دوسرے کالجوں کی نسبت امتیازی مقام حاصل کرتا چلا گیا۔ اس کالج کی ترقی کا سبب وہ فرشتہ صفت بے نفس اور ایثار پیشہ اساتذہ تھے جنہوں نے اپنی زندگیوں کا نذرانہ پیش کر کے گلستان علم کی ایسی آب یاری کی کہ چمن میں بہار آ گئی۔ اور ایسے ایسے خوشنما پھول کھلے کہ اُن کی خوشبو دور دور تک پھیل گئی۔ اُن اساتذہ نے نہ صرف علم سے شاگردوں کے دامن بھرے بلکہ اپنے حُسنِ کردار کی ایسی چھاپ لگائی کہ جس جس نے اُن کو دیکھا تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اُن کے شاگرد احمدی بھی تھے اور غیر از جماعت بھی تھے۔ ہر ایک کے دل میں اُن کی محبت موجزن تھی۔ جس بہار کا ذکر کر رہا ہوں انہی کے دم قدم سے آئی تھی۔ اُن میں سے بہتوں کو ہم سے رُخصت ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ مگر اُن کا ذکر اب تک اپنے ساتھ موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ گویا کہ چشم تصور میں اُن کی روحیں ہمیں یہ کہہ رہی ہوں

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئینِ گُلستاں میں

ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے

تعلیم الاسلام کالج کے ابتدائی بے نفس اور اپنے اپنے مضمون کے متبحر عالم مندرجہ ذیل اساتذہ تھے

1۔ حضرت مرزا ناصر احمد، خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ (اپنی خلافت سے قبل)	پرنسپل
2۔ اخوند عبد القادر صاحب	انگریزی
3۔ صوفی بشارت الرحمٰن صاحب	عربی
4۔ عباس بن عبد القادر صاحب	تاریخ
5۔ چوہدری محمد علی صاحب (بقید حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو صحت والی لمبی زندگی عطا کرے)	فلسفہ
6۔ عبد الاحد صاحب	کیمسٹری
7۔ عطاء الرحمٰن صاحب	فزکس
8۔ حبیب اللہ خان صاحب	کیمسٹری
9۔ ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد صاحب	کیمسٹری
10۔ ڈاکٹر نصیر خان صاحب	فزکس
11۔ ابراہیم ناصر صاحب	ریاضی
12۔ چوہدری حمید اللہ صاحب (بقید حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو صحت والی لمبی زندگی عطا کرے)	ریاضی

میں نے ابتدائی اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ بعد میں آنے والے اساتذہ کے نام طوالت کی وجہ سے نہیں دیے۔ ان سے معذرت کا خواستگا ہوں۔

کالج کے ہاسٹل کا نام فضل عمر ہاسٹل تھا۔ ابتدائی سپرانٹنڈنٹ چوہدری محمد علی صاحب اور ٹیوٹر صوفی بشارت الرحمٰن صاحب تھے۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے کہ تعلیم الاسلام کالج کے پروفیسر اپنے اپنے مضمون میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اگر ان سب کی خوبیوں کا تذکرہ کرنے لگوں تو بہت سے صفحات اسی میں صرف ہو جائیں گے اور باقی اس کالج کی اور خوبیاں بیان کرنی رہ

جائیں گی۔ صرف محترم عطاالرحمٰن صاحب کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔

خدا تعالیٰ کے فضل سے تعلیم الاسلام کالج کا سائنس کا وہ ڈیپارٹمنٹ تھا جس میں مُلک بھر کے چوٹی کے اساتذہ پڑھایا کرتے تھے۔ مجھ سے کسی نے بیان کیا کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے فزکس کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کو کسی طالب علم نے پوچھا کہ پاکستان میں فزکس کا چوٹی کا پروفیسر کون ہے تو اُس نے جواب دیا کہ ڈاکٹر عبدالسلام کے بعد پڑھانے کے لحاظ سے عطاء الرحمٰن صاحب ہیں جو ربوہ میں تعلیم الاسلام کالج میں پڑھا رہے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتے تو پھر میں ہوتا۔ عطاالرحمٰن صاحب کا پڑھانے کے اعلیٰ طریق کے علاوہ اُن کی زندگی کا عملی نمونہ تھا جس سے طلبا متاثر ہوتے تھے۔ تقوٰی کی باریک راہوں پر چلنے والے بزرگ تھے۔ ایک دفعہ اُن کے بیٹے لُطف المنان صاحب نے مجھے بتایا کہ میں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ایک دِن اپنے والد صاحب کی میز پر رکھی ہوئی پنسل لکھنے کے لیے اُٹھائی۔ وہ اس سے کالج کے پیپر مارک کر رہے تھے۔ جب اُنہوں نے مجھے پنسل اُٹھاتے ہوئے دیکھا تو مجھ سے وہ پنسل لے لی اور کہا کہ بیٹا یہ کالج کی پنسل ہے جو مجھے ان پیپروں کے ساتھ دی گئی تھی۔ اس پر تمہارا کوئی حق نہیں بنتا کہ تم استعمال کرو۔ یہ کالج کی امانت ہے۔ مجھ سے پیسے لے کر اور خرید لاؤ۔

قارئین دیکھنے میں یہ نہایت معمولی سا واقعہ معلوم ہوتا ہے مگر بچوں کی ابتدا سے تربیت کے لیے ایسا سبق آموز ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

پھر اس واقعہ سے اُن کی نیک فطرت اجاگر ہوتی ہے۔ وہ کتنے خوش نصیب طلبا ہونگے جنہوں نے فزکس ایسے استاد سے پڑھی ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کے طلبا نے اُن کو نہ بُھلایا ہو گا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب وہ طلبا اپنے اپنے گھروں کو لوٹتے تو اُن کے والدین اُن میں نمایاں تبدیلی دیکھتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو یہی تلقین کرتے تھے کہ اگر اپنے بچوں کی اچھی تربیت کرنی ہے تو اُن کو تعلیم الاسلام کالج میں داخل کرایں جہاں اُن کو دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے تعلیم الاسلام کالج کی عمارت کے افتتاح کے موقع پر فرمایا تھا کہ یہ کالج ہر مذہب و ملت کے لیے کُھلا ہے۔ بشرطیکہ جو بھی اُن کا مذہب یا مسلک ہو وہ اُس کے مطابق خدا کی عبادت ضرور کریں۔ غیر از جماعت طلبا کے لیے نماز کا الگ انتظام کیا جاتا تھا۔ کلاس میں کوئی ایسا اختلافی مسئلہ زیرِ بحث نہیں لایا جاتا تھا کہ لڑکے اس میں اُلجھیں۔ کالج کے ہاسٹل میں تمام مسالک کے طلبا اکٹھے رہتے تھے مگر کبھی بھی مذہبی منافرت کا واقعہ پیش نہیں آیا۔

تعلیم الاسلام کالج کا وہ عہد جو کہ کالج کے قومیائے جانے سے قبل تھا وہ کالج کا سنہری دور تھا۔ اس وقت اس کا عام شہرہ تھا۔ والدین اپنے بچوں کو اس کالج میں داخل کرانے پر دوسرے کالجوں کی نسبت ترجیح دیتے تھے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ قاضی محمد اسلم صاحب جن دنوں تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل تھے میری ڈیوٹی کالج کے داخلوں کی دنوں میں اُن کے ساتھ اُن کو اسسٹ کرنے کے لیے لگی۔ کالج کا یہ طریق ہوا کرتا تھا کہ کالج کے اساتذہ کی باری باری ڈیوٹیاں لگا کرتی تھیں۔ ایک دن میری ڈیوٹی تھی۔ اس دن سرگودھا کے ایک بڑے زمیندار اپنے بیٹے کو داخل کرانے کے لیے تشریف لائے۔ اُنہوں نے پرنسپل صاحب سے کہا کہ میرا بیٹا لاہور کے کسی کالج میں داخل ہونے کا خواہشمند تھا۔ میں نے اُسے کہا تمہارے لیے صرف دو صورتیں ہیں اگر تم پڑھنا چاہتے ہو تو تمہیں تعلیم الاسلام کالج میں پڑھنا ہو گا۔ اگر تم اس کالج میں تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتے تو دوسری صورت یہ ہے کہ زمینداری سنبھال لو۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ اب یہ پڑھنے پر راضی ہو گیا ہے۔ لہٰذا اسے آپ کے کالج کے سپرد کرنے آیا ہوں۔

ربوہ سے ملحق ایک گاؤں لالیاں ہے۔ اس علاقہ کے رئیس ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ خدا نے دولت کے علاوہ اُن کو علم سے بھی نوازا تھا۔ "اوراق" کے ایڈیٹر رہے۔ نیز رسالہ ادبی دُنیا کی ادارت کی۔ پاکستان کے مشہور شاعر بھی تھے۔ اُنہوں نے بھی اپنے بیٹے کو تعلیم الاسلام کالج میں داخل کرایا تھا۔ یہ تو چند مثالیں ہیں۔ ہزاروں غیر از جماعت طلبا نے اس درس گاہ سے تعلیم حاصل کی۔ اُن کو اس میں پڑھنے پر بڑا ناز تھا۔

خدا تعالیٰ کے فضل سے کالج کا ماحول بہت پاکیزہ تھا۔ طلبا کی ذہنی اور تعلیمی ترقی کے لیے سائنس اور آرٹس کے نامور سکالرز کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اُن کی ادبی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے تقریری اور تحریری مقابلے ہوتے۔ اکثر شعرا کو دعوت دی جاتی جو طلبا کو اپنے کلام سے نوازتے۔ جس کی وجہ سے وہ طلبا جن کو خدا تعالیٰ نے شعری وجدان عطا کیا ہوتا اُن کو شعر و سُخن کی ان مجالس سے فائدہ ہوتا۔ اکثر اپنا کلام کالج کے رسالہ المنار میں شائع کراتے۔ جن کو مضامین لکھنے کا شوق ہوتا وہ اپنے مضامین بھی اس رسالہ کے لیے لکھتے۔ خدا تعالیٰ نے یہاں کے طلبا کو ادبی ذوق سے بھی ہمکنار کیا تھا۔ سالانہ مشاعرہ کے لیے جو بین الکلیاتی مباحثہ کے ساتھ منعقد ہوا کرتا تھا۔ مُلک کے مشہور شعرا مدعو کیے جاتے تھے۔ بقول اُن شعرا کے کہ ہم نے

لاہور کے مختلف کالجوں میں مشاعرے پڑھے ہیں۔ اکثر اُن کالجوں کے طلبا نے شاعروں پر سوائے ہوٹنگ کے اور کچھ نہیں سیکھا۔ اچھے شعروں پر داد نہیں دیتے اور ایسے شعروں پر جو کہ داد دینے کے قابل نہیں ہوتے خوب داد دیتے ہیں۔ لیکن جب بھی تعلیم الاسلام کالج میں مشاعرہ پڑھا یہاں کے طلبا نے اچھے شعروں پر ٹوٹ کے داد دی اور معمولی شعر پر خاموش رہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے مشاعروں میں آنے کو دل چاہتا ہے۔ ایک دفعہ تعلیم الاسلام کالج کے سالانہ مشاعرے میں ایک غیر از جماعت شاعر پہلی مرتبہ تشریف لائے۔ انہوں نے بیان کیا کہ میرے ایک شاعر دوست جو اکثر تعلیم الاسلام کالج میں مشاعرہ پر آیا کرتے ہیں انہوں نے مجھے کہا کہ تم بھی اس دفعہ میرے ساتھ چلو۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ یہاں کے طلبا کو شعر کا کتنا فہم ہے۔ اچھے شعروں پر بڑی داد دیتے ہیں۔ لہٰذا اُن کے کہنے پر میں بھی تیار ہو گیا۔ تعلیم الاسلام کالج نے اپنی "وین" ہمیں لے جانے کے لیے بھیجی جہاں سے اُنہوں نے شعرا کو اکٹھا کیا۔ اور وین ربوہ جانے کے لیے چل پڑی۔ جب ہم شیخوپورہ پہنچے تو وہاں کا ماحول لاہور کی نسبت بدل گیا۔ یہاں کے لوگ قدرے دیہاتی معلوم ہوتے تھے۔ اُن کو دیکھ کر کچھ مایوسی ہوئی۔ پھر پنڈی بھٹیاں آیا۔ یہاں کا ماحول اور بدل گیا جو بالکل دیہاتی تھا۔ یہ دیکھ کر دل ملول ہوا۔ اور وہاں کی پنجابی بھی عجیب لگی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ نہ معلوم میرا دوست مجھے کس جگہ لے جا رہا ہے۔ جب ہم چنیوٹ پہنچے تو عورتوں نے کالے رنگ کی دھوتیاں اور کالی قمیضیں پہنی ہوئی تھیں۔ اور وہ عجیب لہجے میں پنجابی بول رہی تھیں۔ یہ سوچ رہا تھا کہ میرے دوست نے مجھے تسلی دی کہ اب ربوہ یہاں سے پانچ چھ میل ہے۔ میں نے خیال کیا کہ اگر چنیوٹ کا یہ ماحول ہے تو چھ میل کے بعد وہاں کا ماحول کیسا ہو گا۔ جب دریا چناب پار کیا تو میرے دوست نے مجھے بتایا کہ یہاں سے ربوہ کی حد شروع ہوتی ہے۔ جب ہم نے درے کو عبور کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہاں کا ماحول یک لخت بدل گیا۔ یہاں عورتیں دیدہ زیب کالے برقعے پہنے ہوئے جا رہی ہیں۔ لڑکے پینٹیں پہنے ہوئے سائیکلوں پر جا رہے ہیں۔ یوں لگا کہ ایک بادل تھا جو چھٹ گیا ہو اور پھر روشنی نمودار ہو گئی ہو۔ آخر ہم کالج کی عمارت میں داخل ہوئے۔ عمارت کو دیکھ کر کچھ حوصلہ ہوا۔ پھر ہم کالج کے ہال میں داخل ہوئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوبصورت وسیع ہال میں طلبا سیاہ رنگ کے گاؤن پہنے ہوئے اور سروں پر ٹوپیاں رکھے ہوئے بڑے وقار سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے بہت بھلے لگے۔ مجھے پہلی دفعہ کسی کالج کا ڈسپلن نظر آیا۔ اُن کی اس یونیفارم نے مجھے بہت متاثر کیا۔ پہلی مرتبہ یہاں میں نے اپنا کلام سنایا۔ اور میرے ہر اچھے شعر پر مجھے داد ملی۔ لڑکوں کی طرف سے میری ہر غزل کے سنانے کے بعد one more, one more کی صدائیں بلند ہوتیں۔ مجھے اتنی محبت ملی کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ لاہور سے ربوہ کے سفر کے دوران جو مایوسی ہوئی تھی جاتی رہی۔ پھر مجھے اپنے دوست پر یقین آیا کہ وہ جو کہتا تھا درست کہتا تھا۔

قارئین، کالج کے اس ڈسپلن کا سہرا اُس وقت کے پرنسپل صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کے سر ہے جن کی محنت شاقہ سے اس کالج کو دوسرے کالجوں پر امتیاز حاصل رہا۔ اُن کی دور اندیش نگاہوں نے جماعت کے اُن غریب ماں باپ کی دلی خواہش کو بھانپ لیا تھا کہ اُن کے بچے بھی تعلیم حاصل کریں۔ لہٰذا اُنہوں نے ایک ایسی یونیفارم تجویز کی جو کم قیمت میں میسر آجائے۔ اور وہ ایسی ہو کہ جس طرح کے بھی کپڑے پہنے ہوئے ہوں خواہ پھٹے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں انڈر گریجویٹ گاؤن اُن کپڑوں کو ڈھانپ دے۔ اور یہ گاؤن صرف 15 روپے کا ملتا تھا۔ اور ٹوپی 3 روپے کی ملتی تھی۔ لہٰذا یہ یونیفارم 18 روپے کی تیار ہو جایا کرتی تھی۔ بعض لوگ اس یونیفارم کو ستارالعیوب بھی کہا کرتے تھے۔ جو بھی معزز مہمان لیکچر دینے کے لیے آئے، سب نے اس یونیفارم کو سراہا۔

خدا تعالیٰ کے فضل سے تعلیم الاسلام کالج کھیلوں کے میدان میں بھی کسی کالج سے پیچھے نہیں تھا۔ کالج کی کشتی رانی ٹیم کو تو کوئی کالج ہرا نہیں سکتا تھا۔ ہر سال چیمپئن شپ کا اعزاز اسی کے حصے رہا۔

باسکٹ بال کی ٹیم کا بھی کوئی جواب نہ تھا۔ کوئی کالج باسکٹ بال ٹیم کو مات نہ دے سکا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ پاکستان میں باسکٹ بال گیم تعلیم الاسلام کالج کی ہی گود میں پلی بڑھی۔ اور پھر یہاں کے فارغ التحصیل طلبا پاکستان کی نیشنل باسکٹ بال ٹیم میں بھی کھیلتے رہے۔

پھر علمی میدان میں بھی اردو اور انگریزی کے بہت اچھے Debaters اس کالج نے تیار کیے۔ بین الکلیاتی مباحثوں میں جہاں جہاں جاتے اکثر ٹرافی جیت کر لاتے۔

پھر تعلیم الاسلام کالج کی امتیازی حیثیت اس طور پر بھی تھی کہ اس میں ایم۔ اے عربی کا ڈیپارٹمنٹ قائم ہوا اور پنجاب یونیورسٹی کے مقابل تعلیم الاسلام کالج کے طلبا کی پہلی 9 یا 10 پوزیشنز ہوا کرتی تھیں۔ تعلیم الاسلام کالج کا نیو کیمپس ایک خطیر رقم خرچ کر کے تعمیر ہوا۔ اس میں ایم۔ ایس۔ سی فزکس ڈیپارٹمنٹ قائم

ہوا۔ اور اس میں بھی یونیورسٹی میں پہلی تین یا چار پوزیشنز تعلیم الاسلام کالج کے طلبا کی آیا کرتی تھیں۔ پھر اُردو کی ایم۔اے کی کلاسز شروع ہونے جا رہی تھیں اور خیال تھا کہ آہستہ آہستہ دوسرے مضامین بھی شروع کر کے اس کو ایک یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ مگر شومئ قسمت سے ایسا نہ ہو پایا۔ اس ادارے کو جماعت احمدیہ سے لے لینے کے بعد جو اس کالج کی حالت ہوئی وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

ملک کے بلند پایہ شعرا، جیسے ثاقب زیروی، کلیم عثمانی، عابد علی عابد، صوفی تبسّم، ضمیر جعفری، عبدالمجید سالکؔ وغیرہ تعلیم الاسلام کالج کے مشاعروں میں شمولیت کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے کالج کے عظیم شعرا چوہدری محمد علی، ڈاکٹر نصیر خان، ڈاکٹر پرویز پروازی بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ اہل ربوہ ان مشاعروں کا شدت سے انتظار کرتے تھے۔

ایک مشاعرے کا ناقابل فراموش واقعہ ابھی تک ذہن پہ نقش ہے۔ اُس کا ذکر کرتا ہوں۔ ایک سال پہلی دفعہ ایک نوجوان شاعر گلزار ہاشمی ہمارے کالج کے مشاعرے میں آئے۔ ہمارے طلبا کو اُن سے تعارف نہ تھا۔ اُن کا حُلیہ لکھنؤ کے بانکوں جیسا تھا۔ وہ پتلے دُبلے تھے۔ سفید کُرتا، کھڑا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ اُن کے سر کے بال لمبے تھے جو آنکھوں پر بھی گرے ہوئے تھے۔ جب وہ ڈائس پر آئے تو اُن کے بال جو آنکھوں پر گرے ہوئے تھے ہٹانے کے لیے سر کی جُنبش سے پیچھے کیے تو لڑکوں نے شور مچایا، نخرہ۔ نخرہ۔ گلزار ہاشمی دیر تک خاموش کھڑے سُنتے رہے۔ جب شور کا طوفان تھما تو پھر گلزار ہاشمی نے پہلا مصرعہ ترنم سے پڑھا۔ اُن کا ترنم مسحور کُن تھا۔

غم کی تصویر ہیں پابہ زنجیر ہیں ہم سے کچھ مت کہو وقت ناساز ہے

اُن کی آواز ہال میں ایسی گونجی کہ ہال میں سنّاٹا چھا گیا۔ شاعر نے پھر پہلے مصرعے کو مکرر پڑھا تو دوسرے مصرعے کو سُننے کے لیے لوگ بیتاب ہو گئے۔ پھر دوسرا مصرعہ یوں مکمل کیا:

چھوڑ کر یہ جہاں جائیں بھی تو کہاں وقت کے تاجرو وقت ناساز ہے

جب شعر مکمل ہوا تو طلبا نے ٹوٹ کر داد دی۔

اسی غزل کے چند اور اشعار درج ذیل ہیں:

ہم کو معلوم ہے ایک مدت ہوئی تم کو رہتے ہوئے ظلم سہتے ہوئے

درد کی چھاؤں میں دکھ بھرے گاؤں میں سُکھ کا مت نام لو وقت ناساز ہے

زندگی درد کا دوسرا نام ہے ہچکیاں سسکیاں اس کا انجام ہے

اب ہے شام الم ہر طرف غم ہی غم جو بھی غم ہو سہو وقت ناساز ہے

کل کا سورج عجب روشنی لائے گا جب یہ انسان انسان کہلائے گا

کل جو تھے ہم نشیں آج ہیں نکتہ چیں سوئے صحرا چلو وقت ناساز ہے

جب وہ پہلی غزل مکمل کر چکے تو ایک اور غزل پڑھنے کی فرمائش کی۔ اس کے بعد تیسری غزل کی فرمائش کی۔ ہر بار داد وصول کرتے رہے۔ اس طرح اُنہوں نے مشاعرہ لوٹ لیا۔

لڑکوں نے گلزار ہاشمی کی غزلیں نوٹ کیں اور اُن کی غزلیں ربوہ کی گلیوں محلوں میں عام لڑکے پڑھتے ہوئے سُنے گئے۔ افسوس کہ گلزار ہاشمی 1969 میں پی۔آئی۔اے کے حادثہ میں قاہرہ میں انتقال کر گئے۔

خدا تعالیٰ کے فضل سے ربوہ کے ماحول نے، ماں باپ کی تربیت نے اور اساتذہ کی محبت نے طلبا کے اذہان کو ایسی جلا بخشی کہ اُن کی ذہانت اُبھر کر سامنے آگئی۔ مندرجہ ذیل ایک واقعہ میرے اس بیان کی تصدیق کرے گا۔

ایک دفعہ پاکستان ملٹری کے ایک میجر اور ایک کیپٹن تعلیم الاسلام کالج تشریف لائے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم پاکستان کے مختلف کالجوں کا دورہ کر رہے ہیں۔ اس میں کالجز کے طلبا کا انٹرویو کر کے کمیشن کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے کالج سے بھی انتخاب کیا جائے تو آپ بی۔اے اور بی۔ایس۔سی کی طلبا کی کلاسوں میں اعلان کروا دیں۔ وہ ہال میں جمع ہو جائیں تا کہ ہم اُن کا انٹرویو لے سکیں۔ وہ اُس وقت سٹاف روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے آکر اطلاع دی کہ طلبا ہال میں جمع ہو گئے ہیں۔ ہم نے کہا کہ چائے آ رہی ہے۔ چائے پی کر انٹرویو لے لیں۔ کہنے لگے کہ ہمارا تجربہ ہے کہ ہم پندرہ یا بیس منٹ میں فارغ ہو جایا کرتے ہیں۔ آپ کی چائے آنے تک ہم آجائیں گے۔ تقریباً اڑھائی گھنٹے کے بعد فارغ ہو کر سٹاف روم میں واپس آئے تو کہنے لگے کہ ہم آپ کے طلبا کا انٹرویو لے کر حیران رہ گئے ہیں۔ ماشاءاللہ بہت ذہین طلبا ہیں۔ کہنے لگے کہ ہم نے لاہور کے چند کالجوں کے طلبا کا انٹرویو لیا ہے اور پھر شیخوپورہ، جھنگ، سرگودھا کے کالجوں میں گئے تو مجبوراً ایک یا دو کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن تعلیم الاسلام کالج کے ساٹھ کے قریب طلبا انٹرویو کے لیے آئے۔ ایک سے ایک بڑھ کر ذہین تھے۔ سمجھ نہیں آ رہی کہ کس کو رکھیں اور کس کو ریجیکٹ کریں۔ پھر بھی ہم نے 38 طلبا کو منتخب کر لیا ہے۔

کالج کے نیشنلائز ہونے کے بعد جو اُس کی اب حالت ہو چکی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اس کالج کا ملک بھر میں نام تھا۔ کبھی اس پر بہار آئی تھی۔ تعلیمی اعتبار سے اس کا نام تھا۔ کھیلوں کے میدان میں اس کا کوئی مدّ مقابل نہ تھا۔ مگر اب۔۔۔۔ اب اس کا یہ حال ہے کہ عمارت کی اینٹیں جگہ جگہ گری ہوئی ہیں۔ کمروں کی چھتیں گری ہوئی ہیں۔ مگر اب بھی اسکی ایک ایک اینٹ اور اُس پر گُزرے ہوئے حسین لمحات زبان حال سے کہہ رہے ہیں:

اے مؤرخ میری اُجڑی ہوئی صورت پہ نہ جا
شہرِ ویراں ہوں مگر وقت کا سرمایہ ہوں

اب جب کہ کالج کی یادوں کا تذکرہ ہو رہا ہے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ کالج کے سٹاف روم میں بیٹھنے والے ان پروفیسر صاحبان کا تذکرہ نہ کروں جو سٹاف روم کی رونق ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ مگر وہ ہماری یادوں سے جدا نہیں ہوئے۔ مضمون کی طوالت کی وجہ سے ان کا فرداً فرداً ذکر نہیں کر سکتا البتہ اگر موقع ملا تو ان کے متعلق علیحدہ تذکرہ کروں گا۔ ہر کوئی ان میں سے اپنی ذات میں ایک انجمن تھا البتہ ان میں سے ایک کا ذکر کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ وہ مسکراتا ہوا، شاداب پر وقار چہرہ محترم قاضی محمد اسلم صاحب پرنسپل تعلیم الاسلام کالج کا تھا جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

جب آپ اپنے دفتر میں کام کرتے تھک جاتے تو وہ سٹاف روم میں تشریف لے آتے اور فرماتے کہ تھوڑی دیر آپ لوگوں میں بیٹھ کر اپنی تھکن دور کر لوں۔ اکثر پروفیسر صاحبان میں باہمی علمی ادبی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ وہ اس کو سن کر بہت محظوظ ہوتے اور اپنی زندگی کے تجربات سے ہمیں فیضیاب کرتے۔ علم و حکمت کے وہ پیکر تھے۔ ان کی علمی قابلیت کی دھاک ملک کی یونیورسٹیوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے خود مشاہدہ کیا کہ بسا اوقات جب بڑے بڑے ماہرین تعلیم ہمارے کالج میں تشریف لاتے تو وہ قاضی صاحب کا بے حد احترام کرتے۔ آپ کو ایک عظیم استاد کی طرح ملتے۔

آپ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ بن جانے کے بعد آپ کے ارشاد پر قاضی صاحب اپنے تمام علمی مشاغل چھوڑ کر تعلیم الاسلام کالج ربوہ تشریف لے آئے۔ اس کالج کی خدمت کی۔ اس کے علاوہ سلسلے کا بہت کام کیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعض کتب کے انگریزی میں تراجم کئے۔

سٹاف روم کے بہت سے ناقابل فراموش واقعات ہیں۔ میں صرف ایک پر اکتفا کروں گا۔ بتانا یہ مطلوب ہے کہ سٹاف روم میں بیٹھنے والے علمی و ادبی گفتگو کرتے تھے۔ ایک دن میں اپنی کلاس پڑھا کر سٹاف روم میں داخل ہوا۔ تو دیکھا کہ پرنسپل صاحب تشریف رکھتے ہیں اور آٹھ دس پروفیسر صاحبان بھی موجود ہیں۔ میں آکر چوہدری عطاء اللہ صاحب کے پاس، جو فارسی کے پروفیسر تھے، بیٹھ گیا۔ چوہدری صاحب نے میرے بیٹھتے ہی مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ عربی والو ذرا اس شعر کا دوسرا مصرعہ تو بتاؤ۔ جب انہوں نے عربی کا مصرعہ پڑھا تو میں نے عرض کی چوہدری صاحب بعض دفعہ کسی بھی زبان کے شعر کا ایک مصرعہ ضرب المثل بن جاتا ہے اور دوسرا مصرعہ ذہنوں سے محو ہو جاتا ہے۔ جب ہماری گفتگو شروع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ہمارا مکالمہ پرنسپل صاحب اور دوسرے بھی بڑے غور سے سن رہے ہیں۔ سر بزم چوہدری صاحب میرے علم کا امتحان لے رہے تھے۔ میرے جواب پر چوہدری صاحب نے فرمایا۔ یہ کوئی بات نہ ہوئی۔ میرے ذہن میں فوراً ایک فارسی کے ایک شعر کا مصرعہ آ گیا۔ میں نے فوراً چوہدری صاحب سے پوچھا فارسی کے اس شعر کا مصرعہ بتائیں۔

کسب کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی

یہ سن کر چوہدری صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اردو شعر کا مشہور مصرعہ جو ہر کوئی پڑھتا ہے وہ سنایا۔ یعنی

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

میں نے کہا چوہدری صاحب اس شعر کا پہلا مصرعہ بتا دیں۔ اس پر چوہدری صاحب مان گئے کہ تم ٹھیک کہتے ہو کہ دوسرا مصرعہ بہت کم لوگوں کے ذہن میں رہتا ہے۔ پرنسپل صاحب اپنے دفتر کو جانے کے لیے اٹھے۔ ہم لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ جاتے ہوئے پرنسپل صاحب نے مسکراتے ہوئے مجھے گلے لگایا اور فرمایا کہ آج تم نے میدان مار لیا ہے۔

تعلیم الاسلام کالج کا دفتری عملہ اور مددگار کارکن بھی بہت مخلص تھے۔ میں کالج کے ایک مددگار کارکن کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ جو احمدی نہ تھا۔ وہ اس وقت سے کالج کی خدمت کر رہا تھا جب کہ تعلیم الاسلام کالج لاہور ہوا کرتا تھا۔ پھر کالج کی حفاظت کرتا رہا۔ رات کالج میں ہی سوتا تھا۔ مذہب کی کوئی سدھ بدھ نہیں تھی۔ اس کا نام شادی تھا۔ شادی نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ سٹاف روم میں ہر کسی پروفیسر کی ٹک شاپ سے چائے وغیرہ لانا اس کا معمول تھا۔ دن کو کالج کے کاموں میں مشغول

ہوتا۔ ہر پریڈ کے لیے وہی گھنٹی بجایا کرتا تھا۔ اس کے مخلص ہونے کا واقعہ بیان کرتا ہوں۔

ایک دفعہ جب پنجاب یونیورسٹی کا B.A B.Sc کا رزلٹ نکلا تو کالج نے اپنے طلبا کا رزلٹ نوٹس بورڈ پر لگا دیا۔ بڑے آ کر اپنا اپنا رزلٹ دیکھ کر خوش ہوتے۔ ان کی خوشی میں شادی بھی بہت خوش ہوتا۔ اس نے ایک طالب علم کو ایک طرف کھڑے اداس دیکھا تو شادی نے اس سے پوچھا کہ تم کیوں اداس کھڑے ہو۔ اس نے کہا کہ شادی میری ایک مضمون میں کمپارٹ آ گئی ہے۔ تو شادی نے کہا کہ تمہاری کمپارٹ کیسے آ سکتی ہے۔ جبکہ میں وقت پر گھنٹی بجاتا رہا ہوں۔

آج جب کہ کالج کی بکھری ہوئی یادیں اکٹھی کرنے بیٹھا ہوں۔ تو شادی اور اس کے اخلاص کی یاد کو فراموش نہیں کر سکتا۔

فضل عمر ہاسٹل

تعلیم الاسلام کالج کا ہاسٹل کا ماحول خدا تعالیٰ کے فضل سے بہت پاکیزہ تھا۔ کالج کے ہاسٹل میں نماز کے لیے دو ہال تھے۔ ایک میں احمدی طلبا نماز پڑھتے تھے اور دوسرے ہال میں غیر از جماعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ پھر عشاء کی نماز کے بعد ایک ہال میں سب اکٹھے ہو جاتے جہاں قران اور حدیث کا درس سب طلبا سُنتے تھے۔ کوئی اختلافی مسئلہ زیر بحث نہیں آتا تھا کہ اُن کے ذہنوں میں کوئی اُلجھن پیدا ہو۔ اگر انفرادی طور پر کسی نے کوئی اختلافی مسئلہ پوچھا ہوتا تو پروفیسر انہیں سمجھا دیتے تھے۔ خاص طور پر غیر از جماعت طلبا کو احمدیت کے بارے میں سنی سنائی باتیں جب ربوہ آ کر دیکھتے تو حیران رہ جاتے کہ جو کچھ ہم نے سُنا وہ ایسا نہیں ہے تو اُن کو جستجو ہوتی کہ الگ سوال کر کے پوچھ لیں۔ بہت سے سعید الفطرت غیر از جماعت طلبا نے احمدیت کا مطالعہ کر کے احمدیت کو قبول کیا۔ یہ بات اُن دنوں کی ہے جب کالج جماعت کے زیر انتظام تھا۔ اُس وقت فضا کچھ اور تھی۔ مجھے بہت سے طلبا کا علم ہے جنہوں نے احمدیت کو قبول کیا۔ یہاں صرف دو طلبا کا ذکر کروں گا۔

لال خان صاحب کو میں نے ربوہ میں اُن کی طالب علمی کے زمانہ سے دیکھا ہوا ہے۔ جب کہ وہ احمدی نہیں تھے۔ اور تعلیم الاسلام کالج کے طالب علم تھے۔ سنا ہے کہ وہ کالج کے ہاسٹل میں غیر از جماعت طلبا کی نماز میں امامت کراتے تھے۔ جمعہ کی نماز بھی پڑھایا کرتے تھے۔ پھر ایک دن وہ آیا کہ سوال پوچھتے پوچھتے احمدیت کو قبول کر لیا۔ خدا تعالیٰ نے انہیں بہت نوازا۔ آج کل وہ کینیڈا جماعت کے امیر ہیں۔

دوسرے صاحب جن کا ذکر کرنا مقصود ہے وہ سجاد احمد صاحب تھے۔ تعلیم الاسلام کالج سے بی۔ ایس۔ سی کی۔ طالب علمی کے زمانہ میں وہ احمدی نہیں تھے۔ اُن کو بھی مسائل کے پوچھنے کی عادت تھی۔ اور جب حق اُن پر کھُل گیا تو اُنہوں نے احمدیت قبول کر لی۔ بی۔ ایس۔ سی کے بعد گورنمنٹ کالج سے ایم۔ ایس۔ سی کیمسٹری میں اوّل پوزیشن حاصل کی اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہاں امریکہ بھی آئے تھے۔ اب وہ وفات پا چکے ہیں۔

اسی طرح کئی طلبا نے جن کی سعید فطرت تھی احمدیت کو قبول کیا تھا۔ اس کے حصول کے لیے اُن کی ذاتی کوشش تھی۔

میں جب تک کالج میں پڑھاتا رہا فضل عمر ہاسٹل کا ٹیوٹر بھی رہا ہوں۔ جس کی وجہ سے ہاسٹل کے تمام طلبا سے میرا تعلق رہا تھا۔ بعض طلبا اپنی ضروریات جو خود پوری نہیں کر سکتے تھے ٹیوٹر صاحبان کو بتا دیا کرتے تھے۔ جس کو سپرنٹنڈنٹ صاحب کے علم میں لا کر حل کر دیا کرتے تھے۔ بعض طلبا سفید پوشی میں رہتے تھے۔ دوسروں کو اپنی کم مائیگی کا پتہ نہ لگنے دیتے تھے۔ ہماری پوری کوشش ہوا کرتی تھی کہ ایسے طلبا کا پتہ لگا کر اُن کی مدد اس طور پر کی جائے کہ اُن کی عزّت نفس مجروح نہ ہو۔ ایسے بہت سے واقعات ہیں جن کا ذکر اس جگہ نہیں کیا جا سکتا۔ صرف ایک ناقابل فراموش واقعہ کا ذکر کرتا ہوں۔

فضل عمر ہاسٹل میں ٹیوٹر کا کمرہ ہاسٹل کے گیٹ کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ دیوار کے کچھ حصے میں شیشہ ہوا کرتا تھا جس میں سے اکثر لڑکوں کی نقل و حرکت کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکا شام کے کھانے کے وقت ہاسٹل سے باہر چلا جاتا اور جب کھانے کا وقت ختم ہو جاتا تو پھر واپس ہاسٹل میں آ جاتا۔ جب دو دن لگاتار حسبِ معمول باہر گیا تو مجھے یہ تجسس پیدا ہوا کہ شاید یہ اتفاق ہے۔ اُسے کوئی کام بھی پڑ سکتا ہے۔ جب میں نے چند دن اور watch کیا تو میں نے اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔ لہٰذا میں نے رجسٹر منگوایا جس میں کھانے کی حاضری لگائی جاتی تھی۔ اگر کسی نے کھانا نہ کھانا ہو تو پہلے ہی بتا دیا کرتا تھا کہ میرا کھانا فلاں وقت بند ہو گا۔ جب میں نے رجسٹر چیک کیا تو دیکھا کہ پورے ہفتے کا شام کا کھانا بند تھا۔ چنانچہ میں نے اُس لڑکے کو دفتر میں بُلایا۔ اور اُس سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ تم متواتر شام کا کھانا نہیں کھا رہے اور تم کھانے کے وقت ہاسٹل سے باہر چلے جاتے ہو اور پھر کھانے کے وقت کے بعد واپس آ جاتے ہو۔ اس پر اُس لڑکے نے ٹالنے کی کوشش کی اور کہا کہ مجھے بھوک نہیں ہوتی لہٰذا میں شام کا کھانا بند کرا دیتا ہوں۔ میں

نے کہا کہ مانا کہ ایک دن یا دو دن بھوک نہیں لگتی۔ لیکن میں نہیں مان سکتا کہ پورا ہفتہ تمہیں بھوک نہ لگے۔ اور تمہاری تو ایک ہفتے سے حاضری بند ہے۔ جب میں نے بڑی ہمدردی کے ساتھ اُس کو کہا کہ دیکھو تمہارے والدین نے ہاسٹل میں داخل کر کے ہمارے سپُرد کیا ہے اور اب ہم تمہارے ماں باپ ہیں۔ اگر تم اپنے گھر میں شام کا کھانا دو دِن نہ کھاؤ تو کیا تمہارے والدین متفکر نہیں ہونگے۔ میرے ہمدردی کے چند بول کچھ ایسے مؤثر ثابت ہوئے کہ اُس کے ضبط کے سارے بند ھن ٹوٹ گئے۔ اور وہ رو پڑا۔ کہنے لگا کہ دو ماہ ہوئے میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہی ہمارے گھر کے کفیل تھے۔ اُن کی وفات کے بعد والدہ نے لکھا کہ اب ہم تمہیں اتنا خرچ نہیں بھجوا سکتے جتنا پہلے بھجواتے تھے۔ جو والدہ نے خرچ بھجوایا اُس میں فیس ادا کرنے کے بعد صرف ایک وقت کا کھانا ہی کھا سکتا ہوں۔ میں کسی کو بھی اپنے حالات بتانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اب چونکہ آپ نے بہت کرید کر پوچھا ہے مجبوراً بتا رہا ہوں۔ یہی سوچا تھا کہ اگر حالات برداشت سے باہر ہو جائیں گے تو پھر پڑھائی چھوڑ کر واپس گھر چلا جاؤں گا۔

یہ سن کر مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ میں نے اُسے کہا کہ فکر مت کرو۔ ہم تمہاری مدد کریں گے۔ دل برداشتہ ہو کر اپنی پڑھائی کو ترک نہ کرنا۔ میں نے پرنسپل محترم قاضی محمد اسلم صاحب کو ساری صورت حال سے مطلع کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے ٹھیک کیا۔ طالب علم کو تسلّی دی ہے۔ اُس کی فیس معاف کرتا ہوں۔ نیز کالج کے کچھ فنڈز ہیں۔ اُس میں سے اُس کا وظیفہ مقرر کر دیتا ہوں۔ وہ اتنا ہو گا کہ کالج کی کتابیں خریدے اور ہاسٹل میں اُس کے کھانے کا انتظام با آسانی ہو جایا کرے گا۔ اُسے یہ بصورت نقدی دیا جائے گا تاکہ وہ تمام لڑکوں کے ساتھ اپنے Dues جمع کرائے۔ اس طور اُس کے کسی ساتھی کو علم نہیں ہو گا۔ اس طرح اُس کی عزّت نفس کو بھی ٹھیس نہ پہنچے گی۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے اُس نے فرسٹ ڈویژن میں بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا۔

اتفاق سے 1982 کے جلسہ سالانہ ربوہ میں میرے اُس کی ملاقات اس طور پر ہوئی کہ جب وہ ملا تو میں اُسے پہچان نہ سکا۔ سولہ سال کے عرصہ میں اُس میں نمایاں تبدیلی آئی ہوئی تھی۔ کہاں وہ دُبلا پتلا کمزور صحت کا بچہ شلوار قمیض میں رہنے والا اب نہایت عمدہ سوٹ پہنے ہوئے اور اچھی کار سے نمودار ہو کر اچانک مجھے یہ کہتے ہوئے سلام کر کے بغلگیر ہوا کہ سر آپ کا کیا حال ہے۔ جب میں نے غور سے پہچاننے کی کوشش کی کی تو میرے متعجب ہونے پر کہنے لگا کہ سر آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں فلاں ہوں جس کی آپ نے مدد کی تھی۔ واقعی اگر آپ میرے بھوکے رہنے کا سبب نہ پوچھتے تو پڑھائی چھوڑ چکا ہوتا۔ بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد مجھے وظیفہ ملا تو میں نے انجنیئرنگ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اُس کے بعد میں ترقی کرتے کرتے ایس۔ ڈی۔ او۔ بن گیا ہوں۔ میری ترقی کرنے میں سب سے زیادہ دخل تعلیم الاسلام کالج کا ہے کہ مجھ جیسے غریب کا سہارا بنا۔ جب بھی اپنے گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتا ہوں تو دِل کی گہرائیوں سے اپنے محسنوں کے لیے دعا نکلتی ہے۔

قارئین، یہ ناقابل فراموش واقعہ نہ میرے ذہن نے فراموش کیا نہ ہی اس طالب علم نے فراموش کیا۔ سولہ سال کے بعد جب وہ ملا تو اُس کے دِل و دماغ پر کالج کی کی ہوئی نیکی نقش تھی۔ نہ معلوم اُس کے دِل سے اس ادارے کے لیے کتنی دعائیں نکلتی ہوں گی۔ یہ صرف ایک واقعہ نہیں۔ ہر سال سینکڑوں واقعات اس کالج میں ہوتے آئے تھے۔ اور اس کالج نے بڑی خوش اسلوبی سے مادر مہربان کی طرح اپنے آغوش میں جگہ دے کر اُن کی زندگیوں کو کندن بنا دیا۔

> **تعلیم الاسلام کالج امید گاہ تھی اُس وقت کے غریب ماں باپ کے دلوں کی حسرتوں کی جو وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے متعلق رکھتے تھے۔**

تعلیم الاسلام کالج امید گاہ تھی اُس وقت کے غریب ماں باپ کے دلوں کی حسرتوں کی جو وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے متعلق رکھتے تھے۔ اُن کی حسرتیں رنگ لائیں۔ اور اُن کے بیٹے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اچھے عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔ اب وہ اُمید گاہ ہم سے چھن چکی ہے۔ اور اب ہمارے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سر گرداں ہیں جو اپنی کم مائیگی کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم ہیں۔ لہٰذا ایسے بے سہارا احمدی طالب علموں کو سہارا دینے کے لیے ہمیں ایسا مضبوط فنڈ اکٹھا کرنا چاہیے جس سے ہم اُن کی اُمیدوں کو مایوس کرنے والے نہ ہوں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم آگے آئیں اور اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

دوستو!

زندگی کی یہی قیمت ہے کہ ارزاں ہو جاؤ
نغمہ درد لیے، موجہء خوشبو کی طرح

عبدالقادر یاد رہے گا!

سمیع اللہ قریشی ایم۔اے

دس سال قبل میں اپنی محبوب درسگاہ تعلیم الاسلام کالج لاہور میں داخل ہوا تھا۔ جب چچا مجھے داخل کرانے کے لیے لے گئے تو ہوسٹل کے قریب سے گذرے۔ لحیم و شحیم بارُعب ڈھیلا ڈھالا کرتہ اور شلوار پہنے ایک شخصیت نظر آئی۔ میرے ایک دوست جو مجھ سے سینئر تھے اور میرے ہمراہ تھے فوراً بولے "یہ پروفیسر اخوند عبدالقادر ہیں۔ وائس پرنسپل۔ انگریزی پڑھاتے ہیں۔"

ان کے پڑھانے کا انداز بھی خوب تھا۔ خصوصاً ڈرامہ اور نظم۔ واہ واہ کیا چٹخارے دار انگریزی بولتے تھے۔ اب بھی آنکھیں بند کر کے گُم سُم بیٹھ جاؤں اور ذہن میں کولرج کی "کرسٹابل" یا بائرن کی "پہلی محبت" کے مصرعے دُہرانے لگوں۔ تو بند آنکھوں میں یادوں کے تخیّلی اُجالے میں اخوند عبدالقادر سامنے آ جاتے ہیں۔ وجیہ، بلند و بالا ٹھوڑی پر ہلکی سی سفید داڑھی۔ خوبصورت شیروانی۔ سفید شلوار۔ پاؤں میں انگریزی جُوتا سر پر پگڑی اور ان سب کو سمیٹے ہوئے ایک پھیلا پھیلا سا گاؤن۔ کلاس میں آتے۔ کتابیں میز پر رکھ دیتے۔ حاضری کا رجسٹر کھولنے سے قبل کیس میں سے عینک نکالتے۔ پھر اسے کھٹ سے بند کر کے رکھ دیتے۔ پگڑی اُتار کر میز کے ایک کونے میں ٹکا دیتے۔ اب ان کے سر پر صاف شفاف چاندی جیسے بال نمایاں ہو جاتے۔ جس کتاب کو پڑھانا مقصود ہوتا، اُسے اپنے سامنے کھول کر رکھ دیتے۔ ایک پیریڈ بھی بعض اوقات صرف ایک مصرعے کی وضاحت کے لیے ناکافی ٹھہرتا۔ اُن کا کہنا تھا کہ شعر کا مطالعہ اس وقت تک بے جان ہے جب تک اُسے دل و دماغ اور رُوح کی مکمل ہم آہنگی میسّر نہ ہو۔ پھر وہ اپنے ساتھ اپنے طلبا کو بھی بائرن، کیٹس، شیلے، کولرج اور شیکسپیئر کی آوارہ رُوحوں کے ساتھ نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرتے۔ ساری جماعت پر ایک سحر زدہ خاموشی کی سی کیفیت طاری رہتی۔ کیا مجال تھی کہ یہ خاموشی ناروا آواز سے ٹوٹ جائے۔ وہ شعر کا کچھ اس طرح تفصیلی اور ہمہ گیر تجزیہ کرتے کہ تشنگی کا کوئی احساس تک باقی نہ رہتا۔ پڑھانے کے دوران کبھی خود بھی موج میں آ جاتے۔ کھو جاتے اور اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چلتے رہتے، بولتے رہتے۔ اور کبھی اپنی شیروانی کی دونوں سامنے کی جیبوں میں عجیب

انداز سے ہاتھ ڈال کرُیوں کھڑے ہو جاتے جیسے کوئی مجسمہ ہو۔ جو ہلتا جُلتا نہیں۔ مگر معانی اور الفاظ کا دریا بہتا چلا جا رہا ہے پگڑی اس دوران میں کبھی پہن لیتے کبھی اُتار دیتے۔ الفاظ اُن کے اپنے قول کے مطابق بلاشبہ اُن کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے کہ جسے حکم ہو وہ آگے آئے۔

پہلے سال ہی کا ذِکر ہے کہ مَیں نے جہاں اُردو میں ایک نظم کہہ کر اُستاذی فیضیؔ صاحب کے حوالے کی وہاں ایک ہلکی پھلکی نظم اُردو ہی کے چند فقرے لکھ کر اُن کا انگریزی میں ترجمہ کر کے کچھ اس طرح کہ اشعار کیسی شکل بن جائے اخوند صاحب کے کمرہ میں بھی ایک لفافے میں بند کر کے چُپکے سے ڈال آیا۔ دُوسرے دن چپڑاسی کے ہاتھ مجھے بُلوا بھیجا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ڈر گیا۔ خوف یہی تھا کہ انگریزی میں نظم تو لکھ لی ہے، اب جب وہ انگریزی میں مجھ سے بات کریں گے، تو جواب کون دے گا۔ پر مَیں ہمت کر کے اُن کے حضور اُن کے رہائشی کمرے میں چلا ہی گیا۔ وہ نماز کی تیاری میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھا تو کِھل کھلا اُٹھے۔ انہوں نے بازو سے پکڑ کر مجھے خود کُرسی پر بٹھا دیا۔ نظم نکال لائے۔ ایک ہی سانس میں کھٹ سے پڑھ گئے۔ مجھ سے کہا، تم سُناؤ۔ اب میری یہ حالت کہ جگہ جگہ گلے میں کوئی چیز جیسے اٹک سی جاتی ہو۔ سُنتے رہے۔ مُسکراتے رہے۔ کچھ تعریف بھی کی وعدہ کیا کہ اسے آئندہ شمارے میں ”المنار“ میں شائع کر رہا ہوں۔ تم کوئی نثر میں بھی مضمون لکھو۔ پھر مَیں نے اجازت چاہی اور اُٹھ آیا۔

رسالہ چھپ گیا اور انگریزی اور اُردو دونوں نظمیں شاملِ اشاعت ہوئیں۔ پھر اگلے چند شماروں میں کچھ اُردو کی اور نظمیں چھپ گئیں۔ حتّٰی کہ مجلسِ ادارت میں بھی مجھے شامل کر لیا گیا۔

بی۔اے کے دونوں سالوں میں وہ ہمیں ڈرامہ اور نظم پڑھاتے رہے۔ ان کے پڑھانے میں اس قدر لطف محسوس ہوتا تھا کہ اکثر سائنس کے طلبا بھی ہمارے آرٹس کے گروپ میں آ بیٹھتے۔ مجھے یاد ہے ورڈزورتھ (Wordsworth) کے صوفیانہ کلام کی تشریح و تفسیر بڑے مزے لے لے کر کیا کرتے تھے۔ کبھی قرآنِ حکیم کی کوئی آیت، کبھی اقبالؔ کے اشعار وہ بڑی روانی اور بے ساختگی کے ساتھ اپنے لیکچر میں سمیٹتے جاتے۔ ان کے درس کی روانی میں بھی ایک سلیقہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے فقرات اور نئے نئے خوبصورت محاورات بیان کی چادر پر موتیوں کی طرح جڑتے چلے جاتے۔ فقرات کی بندشوں اور مرصع تراکیب سے اپنی گفتگو اور کلام کو خوشبودار اور رنگین بناتے۔ ساری جماعت پر خاموشی چھائی رہتی۔ کیا مجال کہ کبھی جو کسی کو شرارت کا خیال تک آیا ہو۔ اور وہ اسی قسم کی صحبتوں میں ملٹن، شیکسپیئر، اور ورڈزورتھ کے اشعار کے وہ وہ نکات بیان کرتے کہ یہی جی چاہتا کہ بس سُنتے چلے جائیں اور کاش آج شادیؔ پیریڈ بجانا بھُول جائے۔ لیکن شادیؔ عین وقت پر گھنٹی بجا دیتا۔ اور اخوند صاحب وہیں جیسے رُک سے جاتے۔ عینک اُتار کر کیس میں، پھٹ سے بند کر کر پگڑی سر پر جماتے اور ”تھینک یو“ کہہ کر چلے جاتے۔

”وہ اسی قسم کی صحبتوں میں ملٹن، شیکسپیئر، اور ورڈزورتھ کے اشعار کے وہ وہ نکات بیان کرتے کہ یہی جی چاہتا کہ بس سُنتے چلے جائیں اور کاش آج شادیؔ پیریڈ بجانا بھُول جائے۔

انہیں اپنے ہر طالب علم سے محبت تھی۔ جو لڑکے کامیاب ہو کے چلے جاتے۔ ان سے بھی بعد میں خط و کتابت رکھا کرتے اور ملتے تو عزت اور محبت سے ملتے۔ ہر لڑکے کا نام اور رول نمبر انہیں زبانی یاد ہوتا۔ ان کا حاضری کا رجسٹر بے حد صاف سُتھرا تھا۔ کہیں کوئی داغ دھبّہ نہ ہوتا۔ اگر کہیں سیاہی گر جاتی، تو انہیں بہت دُکھ ہوتا۔ سب سے زیادہ حاضر باش طالب علم کی بڑی تعریف کرتے۔ اتفاق سے بی۔ اے کے دونوں سالوں میں میری حاضریاں ان کے پیریڈ میں سب سے زیادہ تھیں اس لیے دوسرے لڑکوں کو میری مثال دیا کرتے۔ انہوں نے کبھی کسی کو جُرمانہ نہ کیا تھا۔

ان کے نظم پڑھانے کا انداز بھی خوب تھا۔ کسی لفظ کے معانی بیان کرنے پر آتے تو انگریزی میں متبادل الفاظ کا ڈھیر لگا دیتے۔ اُردو کے الفاظ بھی کبھی کبھی بتا دیا کرتے۔ پوپ (Pope) کی نظم ”ریپ آف دی لاک (Rape of the lock)“ پڑھانے لگے تو صرف عنوان ہی کے اس قدر اُردو تراجم پیش کر گئے کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ مَیں اُن سب متبادل الفاظ کو نظم کے ساتھ ہی حاشیے پر لکھتا گیا تھا۔ وہ کوئی پانچ چھ تھے۔

انہی دنوں میں نے ان کے بارے میں ایک نظم لکھی جو ”المنار“ میں شائع ہوئی اور خاصی پسند کی گئی۔ اس نظم کی ہیئت کچھ یوں تھی۔

ے

عبدالقادر ایک کتاب

پڑھتے جاؤ ختم نہ ہو گی

اس کے لاکھوں باب ــ

کالج سے کامیاب ہو کر فارغ ہونے کے بعد ہی کا ذکر ہے کہ ان کی پیاری سی ننھّی مُنّی بچّی کی وفات کی خبر سُننے میں آئی۔ میں نے ملتان انہیں تعزیّت کا خط لکھا۔ تو شدید صدمے سے دوچار ہونے کے باوجود فوراً جواب دیا۔ لکھا تھا۔ "عزیزم مکرم۔ پیامِ تعزیّت نے دِل کو تڑپا دیا۔ اور میری محبوب و معصُوم بچّی کی طویل و شدید علالت جس سے وہ جانبر نہ ہو سکی، کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ جب کہ زندگی اور موت اس کی ننھّی جان کے لیے نبرد آزما تھیں۔ زندگی ہاری اور موت کی جیت ہوئی۔"

پھر دن گذرتے گئے اور میں کالج سے فارغ ہونے کے بعد کسبِ معاش کی اُلجھنوں میں پھنس گیا۔ اس دوران شاید ہی کبھی ملنا ہوُا ہو۔ ایک خط ان کا پھر مجھے موصول ہوُا جو افسوس ہے محفوظ نہ رہ سکا۔ اب اپنی پُرانی ڈائری کے صفات اُلٹ رہا ہوں تو ۱۳؍ دسمبر ۱۹۵۵ء کا صفحہ سامنے آ گیا۔ غالباً اخوند صاحب ہی کی شخصیّت کو ذہن میں رکھ کر لکھا ہے۔ تاثرات کی مثال اس آئس برگ کی سی ہے۔ جو سمندر میں پانی کی سطح پر تیرتا ہے۔ اس کی صرف چوٹی سطحِ آب سے باہر ہوتی ہے۔ جو سورج کی شعاعوں میں چمکتی ہے۔ لیکن کون جانتا ہے کہ برف کے اس تودہ کے نیچے کتنا بڑا پہاڑ ہے جو سمندر کی تیز رَو میں بہتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں کی آنکھوں سے اوجھل۔

آج کی شام بڑی خوبصورت تھی۔ سیلونی کے چائے خانے میں بیٹھے تھے کہ استاذی اخوند عبدالقادرؒ بھی تشریف لے آئے۔ (میرے واجب صد احترام استاد۔ وہ جن سے مَیں بے حد متاثر ہوُا ہوں۔ اور میرا سر جسے دیکھ کر احتراماً جھک جاتا ہے)۔ اِدھر اُدھر کی بہت سی باتوں کے بعد وُہ مجھ سے میری اُس نظم کے بارے میں باتیں کرتے رہے جو مَیں نے اُن کے بارے میں کالج کے آخری ایّام میں کہی تھی۔ وہ کبھی اپنی دھیمی اور کھنک دار آواز میں کبھی انگریزی، کبھی اُردو، کبھی پنجابی اور کبھی ملتانی میں مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ کہنے لگے۔ "میں ان ساری تعریفوں کے بھلا کب قابل ہوں۔ جو اس نظم میں تم نے میرے لیے روا رکھی ہیں۔ ویسے تم نے مجھے سمجھنے کی کوشش ضرور کی ہے۔"

پھر کسی جلسہ سالانہ کی بات ہے۔ میرے ذمہ ملتان اور مظفر گڑھ کے مہمانوں کے قیام و طعام کا بندوبست تھا۔ ایک دن اچانک مجھے پتہ چلا کہ اخوند صاحب میرے مہمانوں کے ساتھ بیرک کے فرش پر ہی دراز ہیں۔ اور یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم سب کے سب بھاگے بھاگے گئے۔ تو دیکھا کہ وہ اپنے سیاہ رنگ کے سُوٹ کیس کو تکیہ بنائے پرالی پر ہی دراز تھے۔ ان کی گھڑی ان کے قریب ہی دھری تھی۔ میں نے سلام کہا۔ اُٹھ بیٹھے۔ ہم سب سے باتیں کرتے رہے۔ اور اس شام پُرانی یادوں کا سلسلہ پھر تازہ ہو گیا۔ میں نے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی، کالج میں کسی مناسب جگہ چلنے کو کہا، مہمانانِ خاص میں جگہ حاصل کرنے کی تجویز پیش کی لیکن ایک ہی بات کہتے رہے کہ "مسیح موعودؑ کے پیغام کو سُننے آیا ہوں اور اُنہی کے لنگر سے تبرّک کھانے کی خواہش ہے۔ اس راہ میں اگر ننگی زمین پر بھی سونا پڑے گا، تو سوؤں گا۔" چنانچہ اس دوران جتنے دن بھی وہ وہاں رہے، عام مہمانوں ہی کے درمیان اسی حالت میں قیام کرنا پسند کیا۔ انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ ان میں بھی کمزوریاں ہوں گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی خوبیاں ان کی کمزوریوں پر چھا گئی تھیں۔ پھر اچانک سُنا کہ وہ وفات پا چکے ہیں، ان کے شاگردوں میں سے جس جس نے بھی سُنا۔ دم بخود رہ گیا۔ (اللہ تعالیٰ انہیں جنّت الفردوس میں جگہ دے) خود مجھے اس پر یقین نہ آتا تھا۔ اب بھی یہ حالت ہے کہ شیکسپیئر کا کوئی ڈرامہ ورڈزورتھ یا بائرن کی کوئی نظم سامنے آ جاتی ہے تو تعلیم الاسلام کالج بے طرح یاد آنے لگتا ہے۔ پُرانی خوشگوار یادیں، خیال کے اُفق پر بے پناہ ہجوم کرنے لگتی ہیں۔ اور عالمِ تصوّر ہی میں یوں لگتا ہے کہ اخوند صاحب جیسے ابھی سٹاف روم سے اُسی فرّاٹے کے ساتھ نکلیں گے۔

اُن ہی کے بارے میں کہی ہوئی اپنی نظم کا آخری شعر بار بار زبان پر آنے لگتا ہے:

ے

عبدالقادر مٹ نہ سکے گا

عبدالقادر یاد رہے گا

(المنار۔ جنوری تا مارچ ۱۹۶۲ء)

اُردو املا

سفیر رامہ
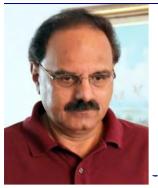
(المنار کے لیے موصول ہونے والے مضامین میں زیادہ تر املا کی غلطیاں ہمزہ کے استعمال میں دکھائی دیتی ہیں جو غالباً املا کے قواعد سے بے توجہی کا نتیجہ ہیں۔ ہمزہ کے استعمال کے چند بنیادی قواعد درجِ ذیل ہیں۔ اس مضمون کے لیے جن کتب سے استفادہ کیا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر رشید حسن خان صاحب کی معرکہ آرا تصنیف 'اُردو املا' ہے)

۱۔ وہ فعل، جن کے ماضی کے صیغے میں یؔ سے پہلے والے حرف پر زیر ہو، اُن میں واحد اور جمع کے صیغوں میں ہمزہ کبھی نہیں آئے گا، جیسے دِیا میں یؔ سے پہلے والے حرف پر زیر ہے۔ اِسکی جمع کی صحیح املا دیے ہوگی جس پر ہمزہ نہیں ہوگا۔ ایسے الفاظ کی کچھ مثالیں درجِ ذیل ہیں:

پینا: پیا، پیے، پییں، پیو، پیے گا، پییں گے، پیو گے۔
سینا: سِیا، سیے، سییں، سیو، سیے گا، سییں گے، سیو گے۔
جینا: جِیا، جیے، جییں، جیو، جیے گا، جییں گے، جیو گے۔
کرنا: کیا، کیے۔
دینا: دیا، دیے۔
لینا: لیا، لیے۔

۲۔ اسی قاعدہ کے مطابق، انگریزی اور دوسری زبانوں کے درجِ ذیل اور اسی قبیل کے وہ دوسرے الفاظ جن میں یؔ سے پہلے والے حرف پر زیر ہو، بغیر ہمزہ کے لکھے جائیں گے۔ انکے آخر سے پہلے والے حرف کی جگہ پر یؔ لکھی جائے گی، ہمزہ نہیں آئے گا:

کیشیر، جونیر، سینیر، بر گیڈیر، ہیر ڈریسر، ہیر ہیر، شکسپیر، بودلیر، جولیس، ایریر، سووی نیر، انڈین، ایرانین، ایشین، السیشین، آرین، کمیڈین، وکٹورین، اِٹالین، بلغارین، رشین، کسٹوڈین، چمپین، شامپین، پولین، سویلین۔

۳۔ لیے۔ فعل کے طور آئے یا حرفِ جار کے طور پر، دونوں صورتوں میں ایک ہی طرح لکھا جائے گا، یعنی: اُس نے گھوڑے لیے۔ اور: میرے لیے گھوڑے لاؤ۔ "لیے" کو اکثر "لئے" لکھا جاتا ہے، یہ بالکل غلط ہے۔

۴۔ ہمزہ صرف اُس صورت میں آئے گا جب یؔ سے پہلے والے حرف پر زبر ہو، یا الف یا واوِ ساکن ہو، جیسے: گیا، گئے۔ بعض مثالیں درجِ ذیل ہیں۔

گیا: گئے
لایا: لائے، لاؤ، لائیں
پایا: پائے، پاؤ، پائیں
گایا: گائے، گاؤ، گائیں
کھایا: کھائے، کھاؤ، کھائیں
آیا: آئے، آؤ، آئیں
دھویا: دھوئے، دھوؤ، دھوئیں
بویا: بوئے، بوؤ، بوئیں
کھویا: کھوئے، کھوؤ، کھوئیں

۵۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کے الفاظ میں جب یؔ پر زبر ہو گی تو وہاں یؔ کی جگہ ہمزہ لکھا جائے گا:

رائفل، جائفل، بائبل، سائکل، لائٹ، پائپ، ٹائپ، نائلون، سائز، فنائل، کرائم، مائکل، پراوڈ، ڈائرکٹر، ڈائرکشن، امپائر، ڈائرکٹری، لائبریری، ڈِزائن، سائڈ، موبائل، وائن، ڈائنامیٹ، سائن بورڈ، جوزفائن، ٹائل، آئل، پائلٹ، مائنس، سائنس، نائٹروجن، ہائڈروجن، سائکالوجی، اجوائن، رسائن، ڈائن، چائنا، وائنا، پائن ایپل۔

۶۔ اِسی طرح عربی کے بہت سے اسم فاعل بھی ہمزہ سے لکھے جائیں گے، جیسے: قائل، سائل، مائل، شائق، قائم، دائم، صائم، لائق، فائق، تائب، نائب، صائب، غائب، دائر، زائر، سائر، طائر، حمائل، ضائع، شائع، فائز، حائز، متشائم، عائد، زائد، مطمئن۔

۷۔ عربی کی جمعوں میں بھی ہمزہ آئے گا، جیسے: مسائل، فضائل، شمائل، رسائل، وسائل، دلائل، قبائل، عجائب، غرائب، حقائق، شقائق، دقائق، کوائف، طوائف، وظائف، نظائر، بصائر، جزائر، دوائر، ذرائع، وقائع، صنائع، بدائع، شرائط، نتائج، جرائد، فوائد، عقائد، عمائد، قصائد، شدائد، نفائس، نقائص، فرائض، خزائن، قبائح، لوائح، قرائن، دفائن، ملائک، عزائم، جرائم۔

۸۔ فعل کی تعظیمی صورت میں ہمیشہ لفظ کے آخر میں دو یؔ آئیں گی۔ جیسے: پیجیے (پ ی ج یے)۔ لیجیے (ل ی ج ی یے) اِن کو "پیجئے" اور "لیجئے" لکھنا غلط ہو گا۔ تعظیمی افعال میں یؔ کی جگہ پر ہمزہ کبھی نہیں آئے گا۔

ایسے کچھ فعل یہ ہیں

مریے، اُبھریے، بھریے، اُتریے، بکھریے، بکھیریے، اُتاریے، اُبھاریے، ماریے، جوڑیے، پھوڑیے، توڑیے، لڑیے، چڑھیے، کھینچیے، لیجیے، پیجیے، دیجیے، کیجیے، لکھیے، پڑھیے، پیچیے، خریدیے۔

۹۔ جن مصدروں میں علامتِ مصدر نآ سے پہلے الف یا واو ہو تا ہے، جیسے: آنا اور بونا: ایسے مصدروں سے جو تعظیمی فعل بنیں گے، ان میں بھی آخر میں دو یؔ (یے) آئیں گی، مگر پہلی یؔ سے پہلے والے حروف (یعنی آخر سے تیسرے حرف) کی جگہ پر ہمزہ آئے گا۔۔ جیسے: جایئے (جاءِ یے) لایئے (لاءِ یے) آیئے (آءِ یے) بویئے (بوءِ ی یے) کھویئے (کھوءِ یے) دوسرے مصدروں میں یہاں پر کوئی اور حرف ہوتا ہے، جیسے: پیجیے (پ ی ج ی یے)، اسی طرح آیئے (آءِ ی یے)۔ ہر صورت میں، ایسے افعال کے آخر میں دو یؔ آئیں گی۔ ایسے کچھ فعل یہ ہیں۔

آیئے، لایئے، جایئے، کھایئے، سویئے۔ بویئے، کھویئے، بُھلایئے، چھپایئے، کھلایئے، لٹایئے۔ اُڑایئے، اُٹھایئے، لکھایئے، رویئے، چبھویئے۔

۱۰۔ مضارع کے لیے ایسے بہت سے (مفرد و مرکّب) لفظ ہیں جن کے آخر میں الف یا واو ہے، ایسے لفظوں میں ئیؔ (ءی) کا لاحقہ شامل کر کے، اسمِ مصدر، فاعل وغیرہ بنایا جاتا ہے، جیسے: رعنائی۔ یہاں آخری حرف یؔ ہے اور اس سے پہلے ءَ ہے۔۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں:

رعنائی، بے پروائی، خودرائی، جادوئی، یک سوئی، کم روئی، بدخوئی، بے وفائی، کج ادائی، تنہائی، بُرائی، اچھائی، ہرجائی، حلوائی، سودائی، شیدائی، جُدائی، یک جائی، ملائی، میرزائی، پُروائی، مصطفائی، مجتبائی، عیسائی، موسائی، مولائی، تبرّائی، تماشائی، تمنّائی، آشنائی۔

۱۱۔ جن لفظوں کے آخر میں یائے ساکن ہوتی ہے، جیسے: زندگی، بے خودی، بندگی وغیرہ: جب یہ لفظ مضاف یا موصوف ہوں گے، اُس صورت میں یؔ کے نیچے اضافت کا زیر آجائے گا، جیسے: زندگیِ عشق، شناسائیِ دیرینہ۔ اضافت کا قاعدہ یہ ہے کہ لفظ کے آخری حرف پر زیر آجاتا ہے۔ جیسے: مشکلؔ سے، مشکلِ حیات، یا جمالؔ سے جمالِ دوست۔ یا ماہؔ سے، ماہِ کامل۔ یا بخششؔ سے، بخششِ عام۔ اِن لفظوں کے لکھنے میں غلطی بھی نہیں ہوتی۔ مگر جن لفظوں کے آخر میں یائے ساکن ہوتی ہے، اضافت کی صورت میں، اُس یؔ پر غلط طور پر ہمزہ لکھ دیا جاتا ہے۔ اس بات کو خاص طور پر ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جن لفظوں کے آخر میں یؔ یا یےؔ ہو (خواہ اصلی یعنی جزوِ لفظ ہو، خواہ اضافی ہو) اضافت کی صوت میں، وہ یؔ مکسور ہو جائے گی، اُس پر ہمزہ ہر گز نہیں لکھا جائے گا۔ مثلاً: "مبتلائے غم" لکھنا غلط۔ ہے کیوں کہ ایک آواز کے لیے دو حرف یک جا نہیں کیے جاتے۔ صحیح املا "مبتلاے غم" ہے۔ مزید کچھ مثالیں یہ ہیں:

زندگیِ فانی، والیِ ملک، بندگیِ خدا، خرابیِ بسیار، خوبیِ قسمت، معزولیِ ناز و ادا، نرمیِ گفتگو، سردیِ کشمیر، گرمیِ نشاطِ تصوّر، جوانیِ بہار، کرسیِ صدارت، آزادیِ وطن، مرضیِ جناب، مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، مخموریِ عیش، مجبوریِ افلاس، صراحیِ مے، فدویِ خاص، کمیِ دولت، زیادتیِ دولت، کج رویِ فلک، کج خرامیِ منافق، سواریِ ریل، فارسیِ جدید، تیاّریِ امتحان، کم فرصتیِ دُنیا۔

۱۲۔ جن لفظوں کے آخر میں الف ہوتا ہے، اضافت کی صورت میں، اُن کے آگے یائے مجہول کا اضافہ کیا جائے گا، جیسے: دنیاے محبت۔ ہمزہ کا یہاں بھی کچھ کام نہیں۔ ایسے کچھ مرکّبات یہ ہیں:

دنیاے رنگ وبو، انتہاے شوق، ابتداے عشق، تماشاے اہلِ کرم، تقاضاے شوق، شہداے کربلا، علماے دین، تمنّاے دل، صلاے کرم، مبتلاے غم، ہواے شوق، دواے دردِ دل۔

۱۳۔ اسی طرح جن لفظوں کے آخر میں واو (معروف یا مجہول) ہوتا ہے، اضافت کی صورت میں، اِن الفاظ کے ساتھ بھی یے کا اضافہ کیا جائے گا۔ ہمزہ یہاں بھی نہیں آئے گا، جیسے:

بوے گل، خوش بوے وفا، گیسوے حور، پہلوے غیر، جادوے بنگال، سوے دار، روے حبیب، جوے کُہستاں، کوے ملامت، آرزوے مسرت، آبروے وفا، چار سوے دہر، رنگ وبوے گلستاں، جستجوے غم، گفتگوے رشک، خوے بد، گوے

سبقت۔

۱۴۔ عربی کے جن الفاظ کے آخر میں اصلاً ہمزہ ہوتا ہے، وہ اردو میں عموماً ہمزہ کے بغیر مستعمل ہیں، جیسے: علما، شے، ابتدا وغیرہ۔

۱۵۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چُکا ہے، اگر لفظ کے بیچ میں الف ساکن ہو اور اُس کے بعد جو حرف ہو اُس پر زیر ہو، تو الف کے بعد ی نہیں، ہمزہ آتا ہے، جیسے: سائل، جائے، لائے، سائکل، پائپ۔ زبر ہو تو ی آئے گی، جیسے: گھایل، پایل۔ اِن کو زبر سے پڑھیے تو ہمزہ آجائے گا، یعنی: گھائل، پائل۔ مگر فارسی عربی کے ایسے لفظ جن کے آخر میں ہائے مختفی ہو، اِس قاعدے سے مستثنا رہیں گے۔ ایسے لفظ بہت زیادہ نہیں۔ زیادہ استعمال ہونے والے لفظ یہ ہیں:

سرمایہ سرمایے

ہم سایہ ہم سایے ہم سایوں

پیرایہ پیرایے پیرایوں

سایہ سایے سایوں

چوپایہ چوپایے چوپایوں

پایہ پایے پایوں

(جاری ہے)

غزل

(افتخار عارف)

شہرِ گُل کے خس و خاشاک سے خوف آتا ہے
جس کا وارث ہوں اسی خاک سے خوف آتا ہے

شکل بننے نہیں پاتی کہ بگڑ جاتی ہے
نئی مٹی کو چاک سے خوف آتا ہے

وقت نے ایسے گھمائے افق، آفاق کہ بس
محورِ گردشِ سفاک سے خوف آتا ہے

یہی لہجہ تھا کہ معیارِ سخن ٹھہرا تھا
اب اسی لہجۂ بے باک سے خوف آتا ہے

آگ جب آگ سے ملتی ہے تو لو دیتی ہے
خاک کو خاک کی پوشاک سے خوف آتا ہے

قامتِ جاں کو خوش آیا تھا کبھی خلعتِ عشق
اب اسی جامۂ صد چاک سے خوف آتا ہے

کبھی افلاک سے نالوں کے جواب آتے تھے
ان دنوں عالمِ افلاک سے خوف آتا ہے

رحمتِ سیّدِ لولاک پہ کامل ایماں
امتِ سیّدِ لولاک سے خوف آتا ہے

کچھ باتیں پنجابی زبان کی

محمد ظفر اللہ

اکثر لوگوں کو یہ کہتے پایا کہ پنجابی سکھوں کی زبان ہے، پر اپنا تجربہ کچھ اور ہی کہانیاں سناتا ہے، اور موجودہ زمانے کی پنجابی میں مسلمانوں کا خاصہ ہاتھ بتاتا ہے۔۔ سوچا ہے کہ جو کچھ یاد ہے پیش کر دوں، ہو سکتا ہے قارئین میں کچھ حضرات اس طرف متوجہ ہو کر اس سلسلے میں معلومات میں اضافہ کا باعث ہوں۔ قبل اس کے کہ میں اپنی قطعی طور پر غیر کتابی اور محض اکتسابی معلومات کا مظاہرہ کرنا شروع کروں مناسب لگتا ہے کہ مختصر الفاظ میں یہ بیان کر دوں کہ، میری ناچیز رائے میں، پنجابی سکھوں کی زبان کیوں کر کہلائی۔

بات یہ ہے کہ پنجابی صرف اس کی زبان ہے جو اس کو بولے، بالکل دوسری زبانوں کی طرح۔ آج کی پنجابی سے ملتی جلتی زبان شمالی ہندوستان کے کئی علاقوں میں بولی جاتی تھی اور حضرت بابا گورونانک کے زمانے سے بہت پہلے سے بولی جاتی تھی۔ وہ علاقے اب سکڑ کر محض مشرقی اور مغربی پنجاب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کو پڑھے لکھوں کی زبان میں کچھ یوں کہیں گے کہ پنجابی انڈو یوروپین زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔

جن ودوانوں نے پنجابی کے ڈانڈے یوروپین زبانوں سے ملائے ان کے پاس بہت سے ثبوت ہوں گے، پر اگر میں ان ثبوتوں کی تلاش میں نکلا تو ڈر ہے کہ گم نہ ہو جاؤں، کہ یہ میرا مضمون نہیں ہے اور نہ ہی اسکا اس بات سے کوئی تعلق ہے جو میں کہنے جا رہا ہوں۔ دوسرے، بڑے بڑے ودوانوں کی باتوں کو سن کر بس سر ہلا دینا چاہیے۔ میں تو بس یہی کرتا ہوں ادھر کسی بڑے ودوان یا نکتہ دان کی بات سنی ادھر سر ہلا دیا، بزا خفش کی طرح، یہ سوچے بغیر کہ بزا خفش کے تو سر میں بھیجا ہی نہیں تھا۔

بات سے بات نکلے تو بات کہاں سے کہاں تک پہنچتی ہے، اسکا تجربہ بس یہ سطور لکھنے میں ہوا۔ تو بات یہ ہو رہی تھی کہ پنجابی سکھوں کی زبان کیوں کر کہلائی۔ لگتا ہے کہ یہ یوں ہوا کہ حضرت باباصاحب گو کہ فارسی بھی جانتے تھے، کہ ملک کی سرکاری زبان تھی اور شاید عربی بھی جانتے ہوں، پر پنجابی ضرور بولتے تھے، کہ پنجاب کے علاقے میں پیدا ہوئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جب انہوں نے اپنی تعلیمات کا پرچار شروع کیا تو وہ بھی پنجابی ہی میں تھا کیوں کہ انکے مخاطب سب پنجاب ہی کے رہنے والے تھے۔

ہمارے باباصاحب ایک بڑے پائے کے مومن تھے اور مومنین کے بارے میں ایک حدیث ہے: مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ سو حضرت باباصاحب نے اپنی مومنانہ فراست سے یہ اندازہ لگا لیا کہ انکو زبانی کلامی سمجھاتے رہیں تو یہ سر ہلاتے رہیں گے، بزا خفش کی طرح، اور پھر بھول جائیں گے، سو ان کو لکھ کر دو۔

کہنا آسان ہے کہ لکھ کر دو کرنا خاصہ مشکل کہ اس زمانے میں جو بھی پنجابی لکھتا تھا وہ فارسی رسم الخط میں لکھتا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ فارسی مسجدوں اور سرکاری دفتروں سے کبھی باہر نہ نکل پائی اس لیے فارسی رسم الخط میں اپنے پند و نصائح لکھنا ان کو گویا ایک خاص طبقے تک محدود کرنا تھا۔ اور پنجابی کا کوئی رسم الخط اس وقت رائج نہیں تھا۔ سو اس کے لیے خدا تعالی نے رہنمائی فرمائی اور باباصاحب نے گورمکھی ایجاد کی۔ بس پھر کیا تھا گرنتھ صاحب لکھی گئی، تحریر میں آجانے کی وجہ سے گوربانیاں زبان زد عام ہوئیں اور گورمکھی میں لکھے پنجابی لٹریچر کی بنیاد پڑ گئی۔ تو اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ پنجابی سکھوں کی زبان ہے تو وہ اس حد تک درست کہیں گے کہ گورمکھی کی وجہ سے پنجابی "لہجہ" میں لکھنے کا رواج پڑا اور گورمکھی میں زیادہ تر سکھ حضرات ہی لکھتے ہیں۔ پر پھر وہی بات کہ پنجابی گورمکھی کے ساتھ تو پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پنجابی تو اس وقت سے ہے، کسی نہ کسی شکل میں، جب سے ادھر یورپ کی طرف سے لوگ آنا شروع ہوئے۔

یورپ سے آنے والے لوگوں، یعنی آریوں، ہنوں اور جاٹوں نے جب شمالی ہندوستان کے دراوڑیوں سے لین دین کیا، انکی عورتیں اپنے گھروں میں ڈال لیں اور

انکو جنوبی علاقوں میں دھکیل دیا تو جو لسانی ملغوبہ وجود میں آیا اسے پنجابی کی لکڑنانی کہا جاسکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض اردو کی تاریخ سے واقف حضرات چونکیں کہ ارے اس طرح تو اردو وجود میں آئی تھی۔

اردو کا فارسی اور ترکی بولنے والے فوجیوں کی مقامی لوگوں سے میل جول اور کاروبار کی کوشش کے نتیجے میں وجود میں آنا تو گویا کل کی بات ہے گو کہ لگتا ہے، وہ عورتیں گھر میں ڈالنے والی بات گو کہ کم ہوئی لیکن ہوئی ضرور ہو گی، ورنہ حسن نثار صاحب اتنے دکھی نہ ہوتے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو میں نے پنجابی کے معرض وجود میں آنے کا جو سماں باندھا ہے وہ بس اردو کی پیدائش ہی سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ مشتق ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اور بہت سی زبانیں مثلاً" سواحیلی، ماریشس میں بولی جانے والی بروکن فرنچ، پجن انگلش جو کہ انیسویں صدی میں چینیوں اور برطانیوں کے لین دین سے وجود میں آئی۔ یہ نام تو اس قدر مقبول ہوا کہ اب بہت سے ملکوں کے ساتھ ایک پجن انگلش کی قسم، مثلا" نائجیرین پجن انگلش منسلک ہے دم چھلے کی طرح۔ تو صاحبو زبانیں اسی طرح بنتی ہیں میل جول کے اور لین دین کے نتیجے میں۔ پنجابی بھی اسی طرح بنی تھی، اور یہ زبان اتنی قدیم ہے کہ پرانی زبانوں کے ماہرین اس کو انڈو یوروپین یا انڈو جرمینک زبانوں میں شمار کرتے ہیں۔ تو پھر یہ تو طے ہے کہ پنجابی صرف سکھوں کی زبان نہیں، بلکہ جیسا کہ میں نے کہا، پنجابی انکی زبان ہے جو اسے بولتے ہیں۔

دوسری طرف یہ بھی طے ہے کہ گورمکھی نے پنجابی کو بہت فائدہ دیا۔ پر وہ بات جو ان سطور کے لکھنے کا باعث ہوئی وہ یہ ہے کہ آج کی پنجابی پر مسلمان صوفیوں کا گہرا اثر ہے، اتنا گہرا اثر کہ سکھ مذہب خود کم از کم ایک یعنی حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے ابیات اور انکی بانیوں سے خوشہ چینی کرتا نظر آتا ہے۔ حضرت بابا گورونانک بہت متاثر تھے حضرت گنج شکر کے فلسفہ اور معرفت سے، اتنے کہ باباصاحب کے پرچار میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کا کلام جابجا ملتا ہے۔

یہ اطلاع میرے لیے تو بے حد حیرت انگیز تھی کہ گرنتھ صاحب میں حضرت باوا فرید الدین گنج شکر کے سو سے زیادہ ابیات اور بانیاں ہیں اور یہ کہ ان میں بعض پر حضرت باوانانک صاحب اور انکے بعد کے گوروؤں نے تفسیریں بھی لکھی ہیں۔ حیرت کی وجہ کچھ یہ ہے کہ آج کوئی غلطی سے بھی یہ کہہ دے کہ حضرت باوا گورونانک صاحب اسلام سے بہت متاثر تھے تو بعض سکھ حضرات مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ سوائے اسکے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے پرانے بزرگ بہت وسیع القلب اور وسیع النظر تھے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ باوانانک تو باوا فرید الدین، ۱۲۶۶-۱۱۷۳، کے بعد یعنی ۱۴۶۹ میں پیدا ہوئے تھے، اور انکے زمانے میں کوئی انٹرنیٹ وغیرہ بھی نہیں تھا کہ آدمی یہ سمجھ لے کہ کہیں سرچ کرتے میں نظر پڑ گئی ہو گی اور پھر وہیں سے انہوں نے باوا فرید کا کلام گرنتھ صاحب میں اٹکالیا ہو گا- تاریخ دانوں کے مطابق بابا نانک خود گئے اور بابا فرید کی درگاہ کے متولی صاحب سے دو بار ملے۔ اور یوں گرنتھ صاحب کے ۱۱۲ اشلوک حضرت بابا فرید کے کلام سے آئے۔ پتا چلتا ہے کہ بعد کے گوروؤں نے بھی حضرت بابا فرید کے کلام سے نہ صرف استفادہ فرمایا بلکہ اس پر مضامین بھی لکھے، زیادہ تر منظوم تبصروں کی صورت میں۔

یہ تو تقریباً وہ صورت ہو گئی کہ الزام انکو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔ یعنی ہم میں سے بعض حضرات جو پنجابی کو سکھوں کی جھولی میں یہ کہہ کر ڈالنے کو تیار بیٹھے رہتے ہیں کہ پنجابی سکھوں کی زبان ہے ان کو اب کوئی اور بہانہ تلاش کرنا چاہئے پنجابی نہ بولنے کا۔ تو پھر یہ تو طے ہے کہ وہ زبان کہ جس کو پنجابی کہیں جاروب کشی کر چکی ہے خانقاہوں میں۔

بابا فرید اور بابانانک کے بعد بھی پنجابی صوفیانہ کلام پھلتا پھولتا رہا۔ اس سلسلے میں قابل ذکر نام ہیں: شاہ حسین، ۱۵۹۹-۱۵۳۸، سلطان باہو، ۱۶۹۱-۱۶۲۸، شاہ شرف، ۱۶۴۰-۱۷۲۴

اور بلھے شاہ، ۱۷۵۷-۱۶۸۰، اور پھر تقریباً انہی بزرگوں کے آخر کے زمانے میں منظوم قصے کہانیوں کا دور شروع ہو گیا۔ مثلاً ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال جن میں کہانی کی ساتھ ساتھ کچھ ٹوٹکے کچھ پند و نصائح گویا ملے جلے ہوتے تھے گو کہ صوفیانہ کلام کی گہرائی ان میں نہیں تھی۔

اس کے بعد گویا صوفی شاعروں اور قصہ گوؤں کا دور ختم ہوا اور اور کچھ نام، خاص طور پر انگریزوں کے دور میں، اس قسم کے آنے لگے: نانک سنگھ، ویر سنگھ اور اس کے بعد امریتا پریتم۔ اور ہو سکتا ہے کہ اسی آخری دور میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا ہو کہ پنجابی سکھوں کی زبان ہے۔ ایک زمانے میں میرا اپنا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن جب ایسے شواہد کی تعداد ایک خاص حد سے بڑھ گئی تو سوچا کہ دیکھنا چاہئے اور نتیجہ برا بھلا جو بھی ہے آپ کے سامنے ہے۔

مضمون کچھ تشنہ رہ جائے گا اگر میں ان شواہد میں سے کچھ پیش نہ کروں۔ اور میں

طول طویل فہرست پیش کرنے نہیں جارہا کہ قارئین کھونے کاڈر ہے، صرف بطور مشتے از خروارے کچھ پیش کر دیتاہوں۔

ہم یہ تو دیکھ چکے کہ پنجابی ادب کی ابتداہی کچھ یوں ہوئی کہ حضرت شیخ فرید الدین، جن کو میں اب تک بابا فرید کے نام سے پکارتا آیاہوں، نے اپنی کیفیات کے اظہار کے لیے یا پند و نصائح کے طور پر جو اشعار کہے ان میں بعض اوقات عربی اور فارسی الفاظ استعمال کئے۔ مثال کے طور پر: ا۔ فریدا، جے توں عقل لطیف کالے لکھ نہ لیکھ ۔اپنے گریوان میں سر نیواں کر ویکھ

کہ اے فرید تجھ میں اگر عقل لطیف ہے تو کالے اعمال اپنے اعمال نامے میں شامل نہ کر اور دوسروں پر انگشت نمائی سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لو۔

۲۔ فریدا خاک نہ نندیے خاکو جیڈھ نہ کوئ۔ جیوندیاں پیراں تھلے مویاں اوپر ہوئی۔

کہ اے فرید خاک کو معمولی نہ جانو کہ اگر یہ تمہارے جیتے جی تمہارے پیروں کے نیچے ہے تو موت کے بعد تمہارے اوپر ہو گی۔

۔۳۔ بڈھا ہویا شیخ فرید کنبن لگی دیہہ ۔جے سو ورھیا جیونا تن ہوسی کھیہ

شیخ فرید بڈھا ہوا تو گاؤں کے لوگ اس سے گھبرانے لگے اگر سو برس بھی جی گیا تو بھی اسکا تن تو مٹی میں ہی ملے گا۔

حضرت باباصاحب کے بہت سے اشعار ٹھیٹھ پنجابی میں بھی تھے جن میں کہیں ہندی کے الفاظ بھی جڑے نظر آتے تھے، گو کہ مضامین صوفیانہ ہی بندھے ہوتے تھے۔

۴۔ فریدا میں جانیا دکھ مجھ کو دکھ سبھاءِ جگ۔ اچے چڑھ کے دیکھیا تاں گھر گھر ایہا اگ

کہ اے فرید میرا خیال تھا کہ میں دکھی ہوں اور یہ دنیامیرے لیے دکھوں کا گھر ہے پر ذرااپنے حالات سے بالا ہو کر دیکھا تو ہر گھر میں یہی آگ لگی تھی۔

۵۔ کوک فریدا کوک، جیویں راکھا جوار۔ جب لگ ٹانڈا نہ گرے تب لگ کوک پکار

یعنی اے فرید شور مچا اس طرح جیسے جوار کی فصل کا رکھوالا شور مچاتا ہے اور اسی کی طرح اس وقت تک شور مچاتارہ جب تک کہ فصل کٹ نہ جائے۔یعنی جب تک کہ خاتمہ بالخیر نہ ہو جائے۔

ان اشعار سے یہ پتا چلتا ہے کہ پنجابی ادب میں بہت سے عربی اور فارسی الفاظ مستعمل تھے جن میں سے بعض بعد کو متروک ہو گئے۔ اور اس بات کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض الفاظ کی ہیئت ہی بدل گئی نطق کے فرق کی وجہ سے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ قادیان کا ابتدائی نام فتح پور قاضیاں تھا اور اسکو فتح پور قاضیاں سے" قادیان بننے میں ایک صدی سے بھی کم عرصہ لگا تھا اور یہاں تو کئی صدیاں بیت چکی ہیں۔

اب یہ حالت ہے کہ کبھی کبھار ایک آدھ لفظ یا ایک آدھ فقرہ ایسا سامنے آجاتا ہے کہ حیرانی ہوتی ہے۔ مثلاً کسی بچے یا بڑے سے نقصان ہو جائے تو اردو میں کہا جاتا ہے "کوئی بات نہیں" پر پنجابی میں اس کے لیے فقرہ ہے "اوہ جانے" ۔ایک بار جو توجہ ہوئی تو خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ فقرہ کسی صوفی کے منہ سے نکلا ہو گا جس نے نقصان کو پورا کرنے والے کی طرف اشارہ کہ وہ یعنی اللہ جانے کہ یہ نقصان کیونکر پورا ہو گا۔

ایک بظاہر پنجابی لفظ ہے گتاوا۔ یاد رہے کہ پنجابی میں بھوسہ اور چوکر کے ملغوبے کو گتاوا کہا جاتا ہے، اور بعض اوقات کسی بھی ملغوبے کو۔ اب ذرا نوٹ کریں کہ ہندوستانی زبانوں میں غین اور گاف کو اکثر متبادل کے طور استعمال کیا جاتا ہے۔ تو گویا گتاوا، غتاوا ہوا۔ اب دیکھیں کہ یہ لفظ غثاء کے کتنا قریب ہے غثاء کے لفظی معنی بھی تقریباً ملغوبہ ہی بنتے ہیں، ایسا ملغوبہ جس میں تنکے بھی ہوں۔ مزہ دوبالا ہو جائے اگر آپکو یہ یقین آجائے کہ عربی نطق میں ث کی آواز ت کے اتنا قریب ہوتی ہے کہ بعض عربوں کو بھی ادائیگی میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ ث کو ت ہی بول جاتے ہیں۔

اوپر بیان کردہ دوسرے شواہد کی موجودگی میں آخری دو شواہد اس چیز کو ثابت کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ پنجابی بول چال اور اور لکھت پڑھت پر مسلمان صوفیاء کا گہرا اثر ہے۔ ان دو شواہد کے شامل کرنے کی وجہ میری یہ جاننے کی خواہش ہے کہ کیا کوئی ایسی پنجابی لغت کی کتاب موجود ہے جس میں کہ الفاظ اور فقرات کی یا تاریخی کنہ (etymology) بھی ساتھ دی گئی ہو؟

اس تعلق میں میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ اگر کسی صاحب علم کی نظر میں کوئی ایسی کتاب ہے جس میں کہ پنجابی میں عربی اور فارسی سے درآمد شدہ الفاظ کی فہرست ہے تو جواب آں مضموں کے تحت کسی آئندہ شمارے میں اس کا ذکر فرمادیں ورنہ مجھ ایسے کم علم لوگ اٹکل سے کام لیتے رہیں گے اور مضامین لکھتے رہیں گے۔

میں نے اس مضموں کے لکھنے میں کچھ اپنی یادداشت سے اور کچھ ذیل کے لنکس سے مدد لی تھی۔

[1] http://en.wikipedia.org/wiki/Fariduddin_Ganjshakar

https://en.wikipedia.org/wiki/Guru_Nanak

اقلیم ادب کے بادشاہ

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

تاریخ ولادت ۱۸۹۲ء تاریخ وفات ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء

زکریا ورک ٹورنٹو، کینیڈا

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تن تنہا ہندوستان کے مسلمانوں کے محسن اعظم سر سید احمد خان کے بکھرے ہوئے مقالات کو پرانے زمانہ کے رسائل و اخبارات سے جمع کر کے اور بعض ایسے مقالوں کو جو ناپید ہو چکے تھے علم دوست اور ادب نواز مشاہیر کے ورثاء کے ذاتی کتب خانوں سے اخذ کر کے ۱۶ ضخیم جلدوں میں مقالات سر سید کے نام سے مرتب کیا تھا۔ مقالات سر سید مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۶۵ء میں شائع کی تھی۔ مقالات سر سید انٹرنیٹ پر اقبال سائبر اکیڈیمی پر دستیاب ہے۔ دیباچہ میں شیخ صاحب کے اس تاریخی علمی کام کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے:

"سر سید کے بیش بہا مضامین جہاں ادبی لحاظ سے وقیع ہیں وہاں پر وہ پر از معلومات بھی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے دماغ میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور مذہبی مسائل اور عقدے حل ہوتے ہیں۔۔۔ یہ مضامین جن اخباروں میں لکھے وہ مدت ہوئی عام نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اور کہیں ان کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ پرانے اخبارات اور رسائل کے فائل کون سنبھال کر رکھتا ہے۔ سر سید کے انتقال کے بعد نصف صدی کا عرصہ گزر گیا مگر کسی کے دل میں ان مضامین کے جمع کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ آخر کار مجلس ترقی ادب کو لاہور کو ان بکھرے ہوئے بیش بہا جواہرات کو جمع کرنے کا خیال آیا۔ مجلس نے ان جواہرات کو ڈھونڈنے اور ایک سلک میں پرونے کے لیے مولانا محمد اسماعیل پانی پتی کا انتخاب کیا جنہوں نے پرانے اخبارات اور قدیم رسالوں کی فائلوں
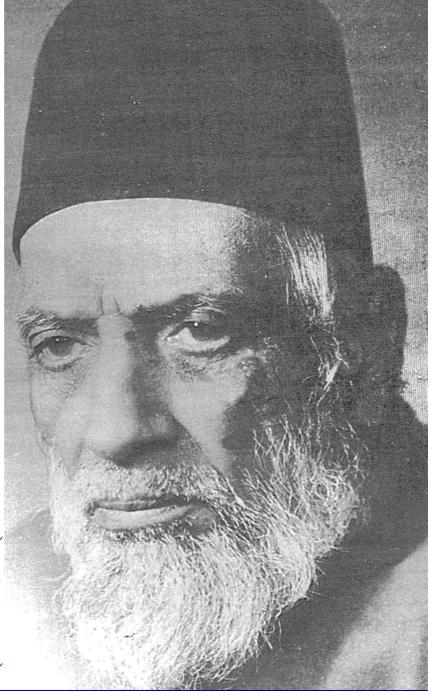
کی تلاش میں دور ونزدیک کے سفر کئے"۔

http://iqbalcyberlibrary.net/Urdu-Books/969-416-225-011/p0002.php

مقالات سرسید ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۲ء امریکہ سے شائع ہونیوالے اردو سہ ماہی رسالہ دیدہ ور کے ویب سائٹ پر بھی دستیاب ہیں، ایڈریس یہ ہے

http://www.deedahwar.net/sirsyed/Miqalaat_E_Sir_Syed/ebook.html

ایک اور بڑا کارنامہ یہ سرانجام دیا کہ شمالی ہندوستان کے علمی گھرانوں میں سرسید احمد خان کے تحریر کردہ جو خطوط محفوظ تھے انہوں بڑی جدوجہد کے بعد انہیں ڈھونڈ نکالا۔ آپ یہ جان جوکھوں والا کام چالیس سال سے کر رہے تھے۔ خطوط کی تلاش کے دوران جو خط آپ کو مل جاتا اس کی نقل کر کے اپنے پاس محفوظ کر لیتے اور اصل خط اس کے مالک کو واپس کر دیتے تھے۔ یوں کرتے کرتے آپ کے پاس سرسید احمد خان کے نادر و نایاب خطوط کا ضخیم مسودہ جمع ہو گیا۔ آپ نے یہ مسودہ مجلس ترقی ادب پاکستان کے حوالے کر دیا۔ یوں مکتوبات سرسید کے نام سے ایک سینکڑوں صفحات پر مشتمل کتاب تیار ہو گئی جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں منصہ شہود پر آیا تھا۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ سرسید احمد خان کی آپ کی تدوین شدہ ایسی کتابیں پاکستان کے مختلف اشاعتی اداروں نے شائع کیں، اور ان کے لیے منفعت بخش ثابت ہوئیں جبکہ آپ کے حصہ کچھ بھی نہ آیا۔

شیخ محمد اسماعیل برصغیر ہند و پاکستان کے جلیل القدر ادیب، قلمکار، محقق اور بلند پایہ مصنف تھے۔ آپ سرسید احمد خاں کے دست راست مولانا الطاف حسین حالی کے ہم وطن تھے۔ پانی پت میں شیخ صاحب کا گھر محلہ شیخاں میں مولانا حالی کے ہمسایہ میں تھا۔ حالی لائبریری کے کئی سال تک انچارج بھی رہے۔

انہوں نے دنیائے ادب میں اپنی اچھوتی قلمکاری و نثر نگاری کے طفیل لوہا منوایا تھا۔ آپ پانی پت کے علم دوست شیخ محمد یعقوب کے فرزند ارجمند تھے۔ انہوں نے فطری استعدادوں کے باعث عصری ادب میں بلند مقام اپنی محنت شاقہ سے حاصل کیا۔ تقسیم ہند سے قبل آپ پانی پت، دہلی، جھنگ اور علی گڑھ میں مقیم رہے تھے۔ کیا ہی اچھا ہو علی گڑھ کا کوئی صاحب علم ان کے علی گڑھ میں گزرے ماہ و سال کا سراغ لگا کر ہمیں معلومات مہیا کر سکے۔

خدا نے آپ کو دو نہایت قابل بیٹوں شیخ محمد احمد پانی پتی اور شیخ مبارک محمود پانی پتی سے نوازا تھا۔ افسوس صد افسوس کہ محمد احمد پانی پتی عین عالم جوانی میں ۳۲ سال کی عمر میں اس دنیائے ناپائدار سے ۱۹۶۲ء میں رخصت ہو گئے۔ محمد احمد باپ کی طرح نہایت قابل اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ شیخ صاحب نے بیٹے کی یاد میں محمد احمد اکیڈیمی کے نام سے اشاعتی ادارہ لاہور میں جاری کیا تھا۔ شیخ مبارک محمود نے ۱۹۹۶ء میں وفات پائی۔ ایک بیٹی حور بانو اس وقت لاہور میں مقیم ہیں۔ آپ کے آٹھ پوتے پوتیاں ہیں۔

شیخ صاحب کا معمول تھا کہ رات کا اکثر حصہ مطالعہ کتب اور تالیف و تصنیف میں گزارتے تھے۔ رات تین بجے کے قریب گھڑی دو گھڑی کے لیے بستر پر لیٹ جاتے اور نیند کا جھونکا لے کر اٹھ جاتے۔ نوافل پڑھنے اور نماز فجر ادا کرنے کے بعد دو تین گھنٹے کے لیے سو جاتے۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد پھر مطالعہ کتب میں مشغول ہو جاتے، خطوط کے جواب تحریر فرماتے یا تصنیف کے کام میں دنیا و مافیا سے بے خبر ہو کر محو ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی ظہر اور عصر کے اوقات کے درمیان بستر استراحت پر لیٹ جاتے۔ عصر کے بعد ادیبوں، دانشوروں کالجوں کے پروفیسروں اور طلبا کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ہر کس و ناکس آپ کی کتابوں کے نادر ذخیرے سے مستفیض ہو تا یا آپ کے ساتھ تبادلہ خیال کر کے ادبی اور علمی مسائل کے سلسلہ میں رہنمائی حاصل کرتا۔ مشتاقان علم کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ رات عشاء کے وقت تک جاری رہتا۔ جوں ہی یکسوئی حاصل ہوتی مطالعہ کتب اور تحقیق و تصنیف میں مصروف ہو جاتے۔ لاہور کے شہریوں کے لیے یہ فیض کا ایک چشمہ تھا جس سے ہر کوئی بلا تفریق سیراب ہوتا۔ اس چشمہ فیض سے سیراب ہونے والوں میں جسٹس ایس۔ اے رحمن بھی تھے۔ جب انہوں نے قتل مرتد کی تردید میں کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو محترم شیخ صاحب سے انہوں نے مواد مہیا کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے یہ سارا مواد محنت شاقہ سے جمع کر کے چیف جسٹس کے حوالے کیا تھا۔

تالیف و تصنیف کے لیے یکسوئی، تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شیخ صاحب کہتے تھے کہ خود میری اپنی یہ حالت ہے کہ رات کے پچھلے پہر کے پرسکون لمحات میں جب مضمون لکھنے بیٹھتا ہوں تو ٹائم پیس اٹھا کر دوسرے کمرے میں رکھ آتا ہوں تا کہ اس کی ٹک ٹک کمرے کے سکون میں خلل انداز نہ ہو۔

شیخ صاحب قبلہ کہتے تھے کہ سکولوں کالجوں کی تعلیم تو حصول علم کی لگن پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اصل علم تو انسان اپنی فطری استعداد سے ذاتی مطالعہ سے حاصل کرتا ہے۔ انہوں نے خود سکول میں تعلیم صرف چوتھی جماعت تک حاصل کی تھی۔ اس کے بعد گھر میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور تمام علمی کتابوں کے وسیع مطالعہ سے حاصل کیا۔ جو کچھ پڑھا سمجھا قلم کو اس کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ صدہا مضامین لکھے،

رسائل کے ایڈیٹر رہے، کتابیں تالیف کیں، اور خود بڑی تعداد میں کتب تصنیف کیں۔ ایم اے (اردو) کے تحقیقی مقالہ کے لیے جن طلبا کو مختلف موضوعات دیے جاتے ہیں ان کے یونیورسٹی کی طرف سے مقرر کردہ گائیڈ پروفیسر بعض طلبا کو ان کے پاس بھیج دیتے تاکہ محترم شیخ صاحب تحقیقی مقالہ کی تیاری میں ان طلبا کی رہ نمائی کر سکیں۔ طلبا ان کی مدد سے تحقیقی مواد اکٹھا کرتے اور ان کی نگرانی میں ہی مقالہ ضبط تحریر میں لانے کے بعد ان کو سناتے تھے۔ درجنوں طلبا یوں ان کی رہ نمائی سے ایم اردو کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔

لاہور میں شیخ صاحب کا بہت قیمتی کتب خانہ تھا جس میں ہر موضوع پر ہزاروں نایاب کتب تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے تمام زندگی رام گلی لاہور کے تین منزلہ مکان میں گزاری۔ افسوس کہ ۱۹۷۴ء کے جماعت احمدیہ کے خلاف مذہبی فسادات میں شرپسندوں نے ان کے گھر پر قبضہ کر لیا اور کتب خانہ فسادات کی نذر ہو گیا۔ متعدد قیمتی کتابیں کباڑیوں کی دکانوں پر ردی کے کاغذات میں ڈال دی گئیں۔ ان نایاب کتب میں سے شمس العلماء مولوی ممتاز علی کا مرتب کردہ قرآنی مضامین کا سات جلدوں پر مشتمل انڈیکس جو تفصیل البیان فی مقاصد القرآن کے نام سے شائع ہوا تھا، شامل تھا۔

لاہور کے ادبی میدان میں آپ کی ہشت پہلو شخصیت سے ہر کوئی واقف تھا۔ معروف ادبی رسالہ نقوش کے مدیر طفیل محمد پر تنگ دستی کے ایسے حالات وارد ہوئے کہ نقوش کی اشاعت بند ہونے لگی تھی۔ وہ محترم شیخ صاحب کے پاس مشورہ کی غرض سے گئے، جنہوں نے ایسا مشورہ دیا کہ نقوش کئی سال تک جاری رہا۔ شیخ صاحب کی وفات پر طفیل محمد کا شاندار، یادوں بھرا مضمون شیخ جی نقوش میں ہی شائع ہوا تھا۔ (مکمل مضمون الفضل ربوہ ۹، اپریل ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا تھا)۔

مضمون میں انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے:

"شیخ صاحب کی بینائی میں بڑی جان تھی، وہ بڑے خوشخط تھے اور بڑا باریک باریک لکھتے تھے، سطریں بالکل سیدھی جیسے کوئی فوجی کھڑا ہو۔ ایک دن مجھے کہنے لگے میں آپ کو چاول کا دانہ دینا چاہتا ہوں۔ میرا جواب تھا کیا آپ مجھ سے دیگ کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ نہیں نہیں، یہ کہہ کر اٹھے اور ایک ڈبیہ اٹھا لائے، کہنے لگے دیکھو، اس ڈبیہ کے اندر کیا ہے؟ میں نے ڈبیہ کھولی تو روئی کے اندر ایک چاول کا دانہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا دانہ بڑا خوش قسمت ہے بڑے اہتمام سے رکھا ہوا ہے۔ کیا قصّہ ہے؟ کہنے لگے چاول کے اس دانہ پر قل ھواللہ لکھی ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے ایک شیشہ دیا اور کہا لو پڑھ لو۔ میں نے شیشے کی مدد سے دیکھا چاول کے دانے پر بڑی مہارت سے قل ھواللہ لکھی ہوئی تھی۔ پوچھا کس نے لکھی ہے جواب دیا میں نے لکھا ہے اور آپ کی نذر ہے"۔

مولوی عبدالحق کا آپ کی مرتب کردہ مقالات حالی کا سرقہ

"مولانا الطاف حسین حالی کے فرزند سجاد حسین حالی 1930ء میں شیخ صاحب کو حیدرآباد (دکن) لے گئے۔ وہاں آپ کی ملاقات مولوی عبدالحق بابائے اردو سے ہوئی۔ مولوی عبدالحق نے شیخ صاحب سے آپ کا مرتب کردہ مولانا حالی کے مضامین کا مجموعہ جو آپ نے ۱۴ سال کی محنت سے ترتیب دیا تھا بڑے اصرار سے اشاعت کے لیے مانگ لیا۔ مگر جب وہ مجموعہ شائع ہوا تو سرورق پر مصنف کا نام بجائے شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے مولوی عبدالحق لکھا ہوا تھا۔ دیباچہ میں مولوی صاحب نے لکھ دیا تھا کہ یہ مضامین کچھ میرے اور کچھ محمد اسماعیل کے مرتب کردہ ہیں۔ بقول شیخ صاحب: حالانکہ ان مضامین کی ایک سطر بھی مولوی صاحب کی مہیا کی نہیں ہوئی تھی۔ یہ سب سے پہلی بدمعاملگی تھی جو کسی پبلشر نے میرے ساتھ کی تھی۔ یہ کتاب آج بھی مولوی عبدالحق کے نام سے مقالات حالی کے طور پر شائع ہوتی ہے۔ شیخ صاحب حالی کے موضوع پر سند تسلیم کئے جاتے تھے۔ مولوی صاحب نے دیباچہ میں اس کا ذکر یوں کیا ہے: بعض مضامین جو انہیں نہیں ملے تھے وہ میں نے دوسرے ذرائع سے بہم پہنچائے۔ ان مضامین کے حاشیے بھی شیخ صاحب کے لکھے ہوئے ہیں۔ میں نے نظر ثانی کرتے وقت حسب ضرورت کہیں کہیں کمی بیشی کر دی ہے ورنہ یہ سب کام انہیں کا کیا ہوا ہے۔" (بحوالہ کتاب براہین احمدیہ: مولوی عبدالحق کا مقدمہ اعظم الکلام، مصنفہ و مرتبہ عاصم جمالی، صفحہ نمبر ۱۶، جھنگ ۲۰۱۳ء)

شیخ صاحب کی تصنیفات اور تالیفات، نیز عربی کتب کے اردو تراجم کی مجموعی تعداد ۱۰۰ سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی نادر کتب کو ایڈٹ کر کے ان میں جگہ جگہ حواشی تحریر کر کے ان کے نئے ایڈیشنز مرتب کئے۔ آپ کی اکثر و بیشتر تصانیف علمی، تاریخی اور سوانحی موضوعات پر تھیں۔ ان میں سے بڑی تعداد ایسی کتب کی بھی ہے جو آپ نے سلیس زبان میں عام فہم انداز میں بچوں کے لیے تصنیف فرمائیں تھیں اور جنہیں اپنے ہی اشاعتی اداروں حالی بک ڈپو اور پھر محمد احمد اکیڈیمی کی طرف سے شائع کیا تھا۔ ہر کتاب مقبول عام ہوئی اور اس کے کئی ایڈیشنز منظر عام پر آئے۔ ان تصنیفات عالیہ میں سے چند ایک یہ ہیں: تاریخ اسلام، تاریخ خلفائے راشدین، اسلام کا نظریہ آزادی، آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیم، دس بڑے مسلمان، بخار

دل، در ثمین فارسی اور سوانح چوہدری محمد حسین (والد گرامی نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام)۔ عربی کتب کے اردو میں تراجم میں سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد کے تراجم اور ان پر آپ کے سیر حاصل مقدمات کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔ بچوں کے لیے اور طالب علموں کے لیے اسلامی تعلیم اور دینیات پر مشتمل کتابیں شائع کیں جیسے ہمارا آقا، آنحضرت ﷺ کی سیرت کے دلچسپ واقعات، رسول اللہ ﷺ کی باتیں۔ آخری دو کتابیں یونیورسٹی آف ٹورنٹو کی روبارٹس Robarts لائبریری میں محفوظ ہیں۔ رسائل کی ادارت، تراجم، تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ آخری دم تک جاری رہا۔

صدر پاکستان محمد ایوب خان نے اپنے دور حکومت ۱۹۵۸ تا ۱۹۶۹ء میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ سرسید کی تصنیف کردہ کتب کے علاوہ ان کے مختلف علمی تربیتی اور اصلاحی موضوعات پر جو بے شمار مضامین اور مقالے اس دور کے اخبارات و رسائل کی زینت بنے تھے ان سب کو کتابی صورت میں جمع کر کے شائع کیا جائے۔ یہ دقت طلب کام مجلس ترقی ادب لاہور کے سپرد ہوا۔ مجلس کی نگاہ شیخ محمد اسماعیل پر پڑی کیونکہ ان کے نزدیک سرسید کے اصلاحی کاموں کے بارہ میں اس کہنہ مشق قلمکار کو سند کا درجہ حاصل تھا۔ چنانچہ تن تنہا سرسید احمد خان کے بکھرے ہوئے مقالات کو ادب نواز مشاہیر کے ورثاء کے ذاتی کتاب خانوں سے اخذ کر کے سولہ جلدوں میں مقالات سرسید نام کی کتاب مرتب کر دی۔ یہ حیرت انگیز کارنامہ اس وقت سرانجام دیا جب آپ کی عمر ساٹھ کی دہائی میں داخل ہو چکی تھی۔

سرسید احمد خان کی بہت سی نایاب قدیم کتب کو آپ نے از سر نو ایڈٹ کر کے جگہ جگہ تشریحی حواشی درج کر کے ان کی افادیت میں اضافہ کیا اور یوں انہیں بہتر نقش ثانی کے طور پر شائع کیا۔ آپ کی ایڈٹ کردہ ایسی متعدد کتابیں مختلف اشاعتی اداروں کی طرف سے پاکستان میں شائع ہوئیں اور ان کے تحقیقی کام کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

شیخ محمد اسماعیل کے گراں قدر کارناموں کا پاکستان میں ایسا ڈنکا بجا کہ حکومت پاکستان نے ۱۹۷۰ء میں آپ کو حسن کارکردگی کے صدارتی ایوارڈ کا حقدار قرار دے کر حسن کارکردگی کا تمغہ Pride of Peformance Medal اور سند آپ کی خدمت میں پیش کی۔ اس اعزاز کے ملنے پر پاکستان اور باہر سے آپ کو مبارکباد کے خطوط موصول ہوئے جن میں غیر ملکی سفیروں، یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں، ادیبوں اور دانشوروں کے خطوط شامل تھے۔ مشہور ماہر تعلیم پروفیسر حمید احمد خان وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے تہنیتی مکتوب میں لکھا کہ صدارتی ایوارڈ کا ملنا آپ کے لیے اعزاز کا باعث نہیں ہے بلکہ یہ تو اس ایوارڈ کے لیے عزت و توقیر کا موجب ہے کہ ادب کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے والی عظیم ہستی کے سینہ پر سجنے کا اعزاز اس کے حصہ میں آیا۔

مشہور ماہر تعلیم پروفیسر حمید احمد خان وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے تہنیتی مکتوب میں لکھا کہ صدارتی ایوارڈ کا ملنا آپ کے لیے اعزاز کا باعث نہیں ہے بلکہ یہ تو اس ایوارڈ کے لیے عزت و توقیر کا موجب ہے کہ ادب کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے والی عظیم ہستی کے سینہ پر سجنے کا اعزاز اس کے حصہ میں آیا۔

شیخ صاحب کا توکل، استغناء اور وضعداری کا مقام بہت بلند تھا۔ جب آپ اوائل زندگی میں بہ سلسلہ ملازمت جھنگ تشریف لائے تو موسم سرما کے ایام تھے۔ کسی کو علم نہ تھا کہ آپ گرم بستر اپنے ہمراہ نہیں لائے تھے۔ محنت اور مجاہدہ کی عادت آپ میں بدرجہ کمال تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ نے کئی راتیں میز کرسی پر ہی لکھنے پڑھنے کے انہماک میں گزار دیں۔ بستر کی احتیاج نے اس ہمت و شان سے استغنا دکھایا کہ کسی کو خبر نہ ہونے دی۔

مہمان نوازی کا خاصہ آپ کی سرشت میں داخل تھا۔ جتنا عرصہ جھنگ شہر میں رہے آپ کا دستر خوان کسی نہ کسی رنگ میں احباب کو خرمی بخشتا رہتا تھا۔ دوسروں سے شفقت سے پیش آنا، نیکی و پرہیزگاری، وضعداری جیسے اوصاف حمیدہ سے متصف تھے۔ نیکی و دینداری، صبر و تحمل، صاف گوئی کا مجسمہ تھے۔

عشق رسول اللہ ﷺ نے شیخ صاحب کے اطوار و شمائل میں عجیب دلکشی پیدا کر دی تھی۔ نبی آخر الزمان ﷺ کی ہر ادا کا نقش لینے کے حریص رہتے تھے۔ نبی پاک ﷺ کی محبت شیخ صاحب کے دل میں شعلہ آتش کی طرح فروزاں تھی۔ اپنی تمام ادبی سرگرمیوں کے باوجود پاک طینت، زاہد شب زندہ دار انسان تھے۔ پانچ نمازوں

کے علاوہ نماز تہجد با قاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ ان کے زہد و اتقاء کے کئی نمونے لوگوں کے دیکھنے میں آئے۔ گھر میں آئے مہمانوں نے رات کی پچھلی پہر خاموش گھڑیوں میں ان کے سجدوں میں آہ وزاری کو بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے عقیدہ کے بارے میں وہ بڑی غیرت رکھتے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت جماعت احمدیہ کے لیے انہوں نے جو فقید المثال کارنامے سرانجام دیے وہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اگر چہ ان کی روزی کا دارومدار ادبی حلقوں اور اشاعتی اداروں تک محدود تھا تاہم وہ اپنے احمدی ہونے کا برملا اعلان کمال درجہ دلیری سے کرتے رہے۔ اس غیرت ایمانی کے بیباک مظاہرے کی وجہ سے انہیں مصائب جھیلنا پڑے مگر آفرین شیخ صاحب پر کہ وہ پیرانہ سالی میں دکھ جھیل جھیل کر اپنے لیے ترقی کے راستہ تراشتے رہے۔ تن تنہا ایسی منزلوں کو سر کر کے دکھایا جس کے لیے بڑی بڑی انجمنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ بے نظیر مؤرخ و مفکر، وسعت خیال رکھنے والا عالم، درویش صفت انسان، جلیل القدر قلمکار کامیاب زندگی گزارنے کے بعد کار کے حادثہ میں ہونے والے زخموں کی تاب نہ لا کر ۱۲، اکتوبر ۱۹۷۲ء کو مشیت ایزدی کے مطابق لاہور میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف سفر کر گیا۔ اس وقت ربوہ (چناب نگر ضلع جھنگ پاکستان) میں آسودہ خاک ہیں۔ ان کے رحلت کر جانے سے ثقافت و ادب کا ایک تاریخی دور اختتام کو پہنچ گیا۔ ان کی وفات پر ان کے فرزند مبارک محمود پانی پتی کو کثیر تعداد میں تعزیتی خطوط موصول ہوئے۔ نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبد السلام نے اپنے والد کے عزیز دوست کی وفات پر اپنے تعزیتی مکتوب میں تحریر فرمایا: "حضرت شیخ صاحب ایک نمونہ تھے جس کا میں کئی بار اپنے لیکچروں میں ذکر کر چکا ہوں۔ ایک صحیح عالم جسے علم کا نشہ ہو، ایسے سخت حالات میں بھی جن سے شیخ صاحب دوچار تھے، بے نیازی کیساتھ علم کی خدمت کر سکتا ہے۔ ہم اپنے نوجوانوں کو تحقیق کے لیے تمام آسائشیں بہم پہنچاتے ہیں، ائیر کنڈیشنر مہیا کئے جاتے ہیں ہر قسم کا سامان ہوتا ہے لیکن وہ پھر بھی کچھ نہیں کر پاتے۔ حضرت شیخ صاحب نے سخت صعوبتیں اٹھائیں لیکن اس کے باوجود علم کی وہ خدمت کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ ان پر راضی ہو"۔

افسوس صد افسوس کہ اقلیم ادب کے اس بادشاہ کے انتقال کی خبر لاہور کے اخبارات نے شائع کرنا گوارا نہ کی۔ اور نہ ہی کسی نے وفات نامہ لکھنے کی زحمت گوارا کی۔ آج آپ کی یادگار آپ کی تصنیف کردہ کتابوں کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں وہ مقالہ جات ہیں جو طالبعلموں نے پی ایچ ڈی کے لیے آپ کی سیرت پر لکھے تھے۔

تحریر کا ایک نمونہ

شیخ صاحبؒ کی سیرت پر یہ مختصر مضمون ختم کرنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ شیخ صاحبؒ کی نگاہ میں سرسید کا کیا مقام تھا اور وہ کس حد تک ان سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"انیسویں صدی اس لحاظ سے تاریخ میں نہایت نمایاں رہے گی کہ اس میں ایک دو نہیں بہت سے ایسے نامور مصلح، ریفارمر، ادیب شاعر مؤرخ اور انشاء پرداز پیدا ہوئے کہ زمانہ ان کی نظیر شاید کبھی نہ لا سکے۔ دنیا ہزاروں لاکھوں چکر کھاتی ہے جب ایسے باکمال لوگ پیدا ہوتے ہیں جیسے قدرت نے اس صدی میں پیدا کئے۔ اب مشاہیر میں سرسید مرحوم اپنی خوبیوں، اپنی لیاقتوں اور اپنے مہتمم بالشان کارناموں کی بدولت بلاشبہ ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ملک کے خیر خواہ قوم کے ہمدرد اور مسلمانوں کے حقیقی غم خوار تھے۔ اپنی ساری عمر انہوں نے قوم کی بھلائی، بہبودی اور ترقی کے غم میں گزار دی مگر قوم کی طرف سے ہمیشہ ان کو نیچری، مرتد، کافر اور بے ایمان کے 'معزز خطابات' سے نوازا گیا۔ اور مکہ معظمہ تک سے ان کے لیے کفر کے فتوے بڑی کوشش اور سعی سے حاصل کر کے تمام ملک میں نہایت کثرت کیساتھ ان کی تشہیر کی گئی۔ قوم کے حقیقی بہی خواہوں کو قوم کی طرف سے ہمیشہ یہی صلا ملا کرتا ہے۔

جو اوصاف و فضائل و محاسن ایک ریفارمر ایک لیڈر ایک مصلح قوم میں ہونی چاہئیں وہ قدرت نے نہایت فیاضی کیساتھ سرسید کو عطا کئے تھے۔ اولوالعزمی و بلند حوصلگی، ہمت و جرات، بہادری و شجاعت و مستقل مزاجی و خود اعتمادی دلیری و بے خوفی، سچائی و راست بازی، ہمدردی و محبت، غیرت و حمیت، عقل و فہم، دانائی و دور اندیشی، تدبیر و تدبر، انتظام و قابلیت، خوش اخلاقی و ملنساری، وقار و متانت، رعب و داب، اثر و رسوخ، قدردانی و حوصلہ افزائی، محنت و جفاکشی، فراخی و حوصلگی، عالی ہمتی، رواداری و بے تعصبی وغیرہ اخلاق حسنہ جن کا ایک لیڈر میں پایا جانا ضروری ہے وہ سب کے سب سرسید کے وجود میں پورے طور پر پائے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ سرسید پیدائشی لیڈر تھے یا خلاق مطلق نے ان کو لیڈری ہی کے لیے پیدا کیا تھا تو شاید کچھ بے جا نہ ہوگا"۔

(تہذیب الاخلاق، سرسید نمبر اکتوبر ۲۰۱۲ء صفحات ۳۷ اور ۴۷، مضمون، سرسید احمد خاں، از قلم شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

جدائی کا لمحہ لمحہ

مکرم سیّد احسن اسمٰعیل صدیقی مرحوم

امتیاز احمد راجیکی، فلاڈلفیا، امریکہ

سیّد احسن اسمٰعیل صدیقی بھی اللہ کو پیارے ہونے والے پیاروں میں شامل ہو گئے۔ شاید آپ کی وفات کا صدمہ میرے لیے ان تمام بزرگوں کی جدائی جیسا ہی ہوتا، جن کے نام سے معمولی سی شناسائی کبھی ''الفضل'' کے توسط سے ہو گئی تھی۔۔۔۔۔اور بس۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔مگر ایک حادثے نے تھوڑے عرصے کے لیے اس نابغۂ روز گار وجود کی صحبت سے فیض پانے کا ایسا موقع فراہم کر دیا کہ باوجود ''رہینِ ستم ہائے روز گار'' کے اس ہستی کے خیال سے کسی لمحے غافل نہ رہ سکا۔

۱۹۸۵ کے اوائل میں ایک حادثے کے باعث بنک سے کچھ عرصہ بیماری کی رخصت پر رہا۔ واپس کام پر پہنچا تو ''صاحبوں'' نے ''الوداع'' کے پروانے سے استقبال کیا۔ معلوم ہوا، چنیوٹ سے کسی نامعلوم ''جزیرے'' گوجرہ کے لیے تبادلے کے احکامات آ چکے ہیں۔ بہت سٹپٹایا، کچھ بے سروپا احتجاج کیا، کچھ بے نتیجہ ہاتھ پاؤں مارے؛ مگر کوئی پیش نہ چلی۔ چاروناچار حکمِ حاکم مرگِ مفاجات رختِ سفر باندھا۔ حد تو یہ تھی کہ گوجرے کا رستہ تک معلوم نہ تھا۔ کبھی چناب ایکسپریس کے سفر کے دوران میں کسی سٹیشن پر اس نام کے بورڈ پر اچٹتی سی نگاہ ضرور پڑی تھی، مگر اس اچانک خبر نے ذہن کی تختی بالکل صاف کر دی۔ مخبوط الحواسی میں کبھی اسے فیصل آباد اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نواح میں سمجھنے لگتا، کبھی راولپنڈی کے مضافات میں گوجر خاں آنکھوں کے گرد تارے دکھانے لگتا۔

آخر ایک روز پوچھتا پچھاتا، بسیں تانگے بدلتا بدلاتا منزل پر پہنچ گیا۔ وہاں پر بنک کا عملہ اپنے نئے افسر کی آمد کا بڑی بے تابی سے منتظر تھا۔ اوّل تو میرے نام کے ہجّے اور تلفظ کرتے کرتے ان کے پسینے چھوٹے ہوئے تھے، اوپر سے میری ہیت کذائی نے ان کی خوش آئند توقعات کو شدید دھچکا لگایا۔ ابھی وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہو پائے تھے کہ میں نے ایک اور دھماکا کر دیا:

''چنیوٹ سے ٹرانسفر ہو کر آیا ہوں، ربوہ کا رہنے والا ہوں۔ اور یہاں قریب میں 'مقبول دواخانہ' نامی کسی احمدی دوست کا مطب ہے، ذرا اس کا رستہ تو بتا دیجئے۔''

میں نے سوچا، قسطوں میں تعارف کرانے اور ان کی امیدوں پر آہستہ آہستہ اوس ڈالنے کے بجائے یکبار گی کھل کر سامنے آ جانا بہتر ہے؛ تاکہ ان کی نفرت اور غیض وغضب کی پٹاریوں میں جو جو سانپ پنپ رہے ہیں، نکل باہر آئیں۔ اور اگر یہاں سے بھی دیس نکالا مقدر ہے، تو پھر دیر کاہے کی۔

میرا یہ اچانک وار بڑا کاری ثابت ہوا۔ اور بقول بابائے اردو حضرت مولانا صلاح الدین مرحوم: ''ان کے ذہنوں میں تجسّس کے جو کیڑے کُلبلا رہے تھے، وہ آسودہ تو نہ ہوئے مگر سکتے میں ضرور آ گئے۔'' چنانچہ انھوں نے نہ صرف مقبول دواخانے کی طرف رہنمائی کر دی؛ بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ وہاں سے چند قدم پر دو گلیاں چھوڑ کر احمدیہ مسجد بھی ہے۔ میں نے انھیں ''اللہ تمھارا بھلا کرے'' کہا اور پہلے طوفان کے ٹل جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

ابتداً کچھ عرصہ میں روزانہ قریباً پانچ چھ گھنٹے کا سفر کر کے ربوہ واپس آ جایا کرتا تھا، مگر رفتہ رفتہ دونوں طرف سے برداشت کی حدیں جواب دینے لگیں؛ چنانچہ بنک کے سامنے ایک مختصر سا فلیٹ کرایہ پر لے کر بیوی بچے سمیت مستقلاً وہیں براجمان ہو گیا۔ اس دوران میں ارد گرد تعارف اور رسم وراہ کے سلسلے چل نکلے۔ معلوم ہوا کہ میرا عزیز دوست طارق جاوید یہیں پر مربیٔ سلسلہ کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اور قرب وجوار میں احمدیت کی کئی ننھی ننھی کونپلیں بہار دکھا رہی ہیں اور شدید تھپیڑوں کے آگے بڑی استقامت اور مستقل مزاجی سے سینہ سپر ہیں۔ دوسری طرف بنک والوں کی خشمگیں نگاہوں میں کچھ مانوسیت یا برداشت کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ اور فضا میں کسی بڑے طوفان کی آمد سے پہلے والا سکوت قائم ہونے لگا۔

یہ اِبتدا تھی اس بستی میں مختصر سے ہنگامہ خیز قیام کی، جو میرے لیے کئی

رنگ میں سنگِ میل ثابت ہوا ——— مگر یہاں کچھ چیزیں میرے اندازے اور تصور سے بالاتر تھیں ———

میرے نزدیک گوجرہ آڑھتیوں کی ایک منڈی تھی، جس میں بڑی بڑی توند والے سیٹھوں، رسہ گیر زمیندار وڈیروں اور محنت کش مزدوروں اور کسانوں کے علاوہ کسی شَے کا پایا جانا محال تھا۔ میرے وہم و گمان کے کسی گوشے میں یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ یہ مقام علم و ادب، حسن و لطافت اور ذوقِ سلیم سے بھی کوئی علاقہ رکھ سکتا ہے۔ مگر کچھ ہی عرصہ میں یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس مشہور زمانہ آڑھتیوں کے شہر گوجرہ کی گُدڑیوں میں شعر و سخن اور علم و معرفت کے نادرالوجود لعل چھپے ہوئے ہیں۔ بھانت بھانت کے خرید و فروخت کے شور و شر اور اناج سبزی کی نیلامی کی بولیوں کے بیچ بیچ کچھ بہت ہی حسین جذبات کے نغمے، کچھ بہت ہی نازک احساسات کے ترانے ہلکے ہلکے مدھم مگر واضح سُروں میں اپنی لے قائم کئے ہوئے ہیں۔ باوجود شعر و سخن کے اعلیٰ ذوق سے عاری ہونے کے یہ لے انجانے میں مجھے اپنانے لگی۔ ایک بے کیف یگانگت اور قربت کے احساس سے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ تب محسوس ہوا کہ اس بستی میں کچھ بہت ہی محبت کرنے والی، کچھ بہت ہی گریہ کرنے والی ہستیاں ہیں؛ جن کی اپنایت پھولوں کی خوشبو کی طرح ہے، جسے لاکھ کوشش کریں پابندِ سلاسل نہیں کر سکتے۔ کوئی اس تک پہنچ پائے نہ پائے، وہ خود ان تک پہنچ جائے گی۔

ان بزرگ ہستیوں میں ایک بہت ہی ہر دلعزیز شخصیت مکرم و محترم سیّد احسن اسمٰعیل صدیقی صاحب کی تھی۔ نہایت سادہ، درویش مزاج منفرد شخصیت۔ اپنی جسمانی ساخت اور کمزوری کے باوجود انتہائی حوصلے، تدبّر اور ہمدردی کی حامل ہستی۔ ایک شفیق استاد اور لائبریرین کی حیثیت سے آپ نے طویل عرصے تک اہلِ گوجرہ کی بے مثل خدمت کی۔ باوجود مذہبی اختلاف اور علاقے میں پائے جانے والے عمومی بغض و عناد کے گوجرہ کے تمام طبقات میں آپ کو بڑی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

شخصیت کا یہ پہلو افاضۂ خاص و عام تھا اور ہر کس و ناکس کے لیے یکساں وا ——— مگر ایک رخ ''اپنوں'' کے لیے تھا، اور ذرا قریب ہونے پر محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہستی کتنی نرم، کتنی ہمدرد، کتنی مہربان اور کتنی شفیق ہے ———

یہ دور پاکستان کے احمدیوں کے لیے بڑا کٹھن تھا۔ اسے ایک ناکام اور بے بس دشمن کے دانت پیسنے اور انتقاماً ہر شَے کو تہس نہس کر دینے سے مماثلت دی جاسکتی ہے۔ احمدیہ مساجد کو مسمار کرنے، آگیں لگانے، کلمہ مٹانے اور معصوم شہریوں کو مقدمات اور حوالات کی سختیوں سے دوچار کرنا روزمرہ کا معمول تھا۔ گوجرہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کی جماعت احمدیہ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ مربیِّ ضلع اور قائد خدام الاحمدیہ یہیں رہتے تھے۔ اور امیر ضلع محترم چوہدری قادر صاحب بھی قریبی گاؤں جلیانوالہ میں رہائش پذیر تھے۔ اس لحاظ سے یہ مقام جماعتی سرگرمیوں کا مرکز تھا؛ گویا علاقے میں ہونے والے ہر واقعے، ہر سختی، ہر دکھ کا درد یہاں کے باسیوں کو سہنا پڑتا۔ انھیں دنوں ٹوبہ ٹیک سنگھ، گوجرہ اور گرد و نواح کے کئی دیہات کی مساجد کو جلانے، مسمار کرنے اور کلمہ مٹانے کی وارداتیں ہوتی رہتیں، اور الٹے مقدمات احمدیوں پر بنائے جاتے۔ اکثر انھیں قید و بند کی صعوبتوں اور طویل مقدمہ بازی کی اذیتوں سے گزرنا پڑتا۔ ظلم کی انتہا ملاحظہ ہو، ایک گیارہ سالہ معصوم بچے پر جھوٹی گواہیوں کی بنا پر کلامِ الٰہی جلانے کا انتہائی ظالمانہ مقدمہ قائم کر دیا گیا۔

کرب و بلا کے اس مسلسل اذیتناک دور میں اس چھوٹی سی جمعیت میں غیر معمولی قرابت، تعاون اور رشتۂ اخوت و محبت کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔ حسنِ اتفاق سے بوقتِ ضرورت ایک سوزوکی جیپ میرے ہتھے لگ جایا کرتی تھی؛ چنانچہ امیر صاحب ضلع، مربّی صاحب یا قائد صاحب کے ہمراہ ضلع کی مختلف جماعتوں کے دورے کا موقع ملتا رہتا۔ اور ہر بار خوشی کی خبروں سے زیادہ کچھ ایسے تکلیف دہ حالات کا سامنا کرنا پڑتا کہ وجود چور چور ہو جاتا۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا، جسم کچل دیا گیا ہے اور روح ڈھیروں بوجھ تلے دب گئی ہے ——— ایسے میں جو ہستی ہمیشہ ڈھارس، تسلی اور ولولۂ نو کا باعث بنتی ——— وہ سیّد احسن اسمٰعیل صدیقی صاحب کی شخصیت تھی۔ تھکے ماندے، زخموں سے چور، پژمردہ چہرے لیے حاضر ہوتے اور اس متبسّم اور متبرک وجود سے مسکراہٹیں اور جواں حوصلے لے کر واپس لوٹتے۔ کبھی اپنے دلکش شیریں کلام سے ساری تھکاوٹیں دور کر دیتے، کبھی اسلاف کی قربانیوں کے تذکرے بیان کر کے ولولے تازہ کرتے۔ کبھی صرف خاموشی سے پیغام دیتے کہ ان موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے چھپی ہوئی گہری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو، نیلگوں سمندروں میں پوشیدہ کتنے طوفانوں کا پتا دے رہی ہیں؛ پھر بھی سطح پر کیسی پُر سکون ہیں۔ اس سرخ و سپید چہرے پر چھائی ہوئی زردی کی تہوں کو پلٹ کر دیکھو، کیسی کیسی صحرا نوردی، کیسی کیسی دشت گردی کی خبر دے رہی ہیں ———

غرض اس دورِ ابتلا میں خدا تعالیٰ نے اس وجود کو رحمت کی چٹان بنا دیا، جو اکیلی طوفانوں میں سر اٹھائے ہر دکھ اپنے سینے پر سہہ رہی ہو اور مسلسل رہِ منزل کا نشان بنی

ہو۔

کبھی گزرتے گزرتے صدیقی صاحب کا حال پوچھنے "چراغ منزل" پر رک جاتا۔ ان کی اہلیہ محترمہ اور بچوں کی ایسی محبت تھی کہ کسی حالت میں دروازے سے واپس نہ لوٹنے دیتے۔ لازماً اندر بٹھالیتے اور انتہائی منع کرنے کے باوجود صدیقی صاحب کو اطلاع دے دیتے۔ میری طبیعت پر یہ بات بڑی گراں گزرتی کہ ایک بزرگ شخص بیماری کی حالت میں نہایت تکلیف اٹھا کر دوسری منزل سے نیچے اترے؛ مگر یہ ممکن نہ تھا کہ ایک بار حاضر ہو جاتا تو زیارت سے محروم رہتا۔ انھیں یہ گوارا ہی نہیں تھا کہ در پر آئے ہوئے کسی فقیر کو خالی ہاتھ جانے دیتے۔ اگر کوئی محبت کی بولی لے کر آیا ہے تو اس کے کشکول کو اس سے بہتر محبت کی جزا سے بھرے بغیر انہیں چین نہ آتا تھا۔ ان کی یہی محبتیں تھیں جو ہر خاص و عام کو ان کا دیوانہ بنائے رکھتیں ——— وہ بالکل سادہ، بالکل بے ریا، بالکل بے لوث تھیں۔ ان کی تہہ میں ایک بے پایاں عشق پوشیدہ تھا، جس کے منبع میں سچی محبت کا اک چشمۂ رواں موجزن تھا، جو اپنے رنگ میں بے مثل اور بے نظیر تھا ——— اور وہ تھا خلافت سے بے پناہ عشق۔ امام وقت سے دیوانہ وار قلبی تعلق اور عقیدت۔

میں نے صدیقی صاحب کے عشقِ خلافت کو بے نظیر کہا ہے۔ کسی مبالغہ کی بنا پر نہیں، ایک ٹھوس حقیقت کی بنیاد پر؛ کیونکہ سچا عشق ہمیشہ بے نظیر ہی ہوتا ہے۔ اس کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ کسی دیکھنے والے کی نظر میں وہ کم تر یا برتر ہو سکتا ہے؛ مگر اپنے طور پر، اپنی استعداد میں، اپنی قدرت میں وہ فنا کی انتہا رکھتا ہے۔ فدائیت کی معراج ہوتا ہے۔ اپنا سب کچھ لٹا دینے کا حوصلہ اور عزم رکھتا ہے۔ سچا عشق چاہے بادشاہ کا ہو یا فقیر کا، ایک برابر ہوتا ہے۔ وہ بادشاہوں سے تخت چھڑانے کا ملکہ رکھتا ہے اور فقیروں کو تخت کا وارث بنانے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

باوجود اپنی علمی کم مائیگی، تفاوتِ عمری اور ذوقِ شعر و سخن سے عاری ہونے کے، میری صدیقی صاحب سے قلبی تعلق کی ایک خاص وجہ تھی ——— اور وہ تھی اک دردِ مشترک ——— ایک مشترکہ محبوب کی جدائی کا صدمہ ——— غمِ ہجراں کی کسک، کچھ کھو دینے کا غم، کچھ پالینے کی حسرت:

یہ عشق ایسا روگ ہے، چھپائے چھپ نہ پائے ہے
یہ درد ایسا درد ہے، جو بانٹے بڑھتا جائے ہے

اور فی الحقیقت اس عشق کا لطف ہی نرالا ہے۔ اس میں رقابت کا تصور ہی جدا ہے۔ یہاں تو اسی تمنا میں عمر کٹتی ہے کہ میرے محبوب کے چاہنے والے اور بھی ہوں۔ اس کے قدموں میں نچھاور ہونے، اس کی چاہتوں میں شریک ہونے والے اور بھی بڑھیں۔

کوئے جاناں کو رقیبِ ہمنوا کے ہیں قدم اٹھے
میں لوں اس بلائیں، خیر ہو اس کی، نہ وہ بھٹکے
تجھے اپنا نہ کیوں سمجھوں، تو ساقی میرے ہمدم کا
تیرے صدقے نہ کیوں جاؤں، تو راکھی میرے بالم کا

یہ وہ دور تھا، جب محبوب آقا کی جدائی کا غم بہت تازہ تھا۔ اس زخم کو کریدنا بھی بھلا لگتا۔ اس کو ہر ا رکھنا بھی دل کو بھاتا۔ جتنا وہ رستا، اتنا ہی گداز بخشتا۔ جتنا وہ چھڑتا، اتنا ہی سوز سے ہمکنار ہوتا ——— اور یہ درد تھا بھی دو آتشہ۔ وہ محبوب جس کی جدائی میں اِک دنیا بے قرار تھی، وہ اپنے پیاروں کی دوری میں ان سے بڑھ کر تڑپ رہا تھا۔ اور بالآخر یہ تڑپ ایک درد بھرے خوبصورت کلام میں ڈھل گئی۔ اُن دنوں حضرت صاحب کی نظم: "کسی غریب الوطن مسافر کی چاہتوں کا سلام کہنا" نے ایک جہاں کو تڑپا دیا۔ اس کی نغمگی، اس کی کسک، اس کا سوز گویا ہر دل کی دھڑکن بن گیا۔ کئی احمدی شعرا نے بھی اس درد میں ڈوب کر اسی رنگ میں طبع آزمائی کی۔ سیّد اسمٰعیل صدیقی صاحب نے بھی اس کے جواب میں آقا کی خدمت میں "تیری جدائی کا لمحہ لمحہ" نامی نظم بطور ہدیۂ نذر و عقیدت پیش کی۔ مجھے علم نہیں، ان کا یہ کلام منظرِ عام پر آیا یا نہیں؛ مگر میری یہ خوش قسمتی ہے کہ براہِ راست صدیقی صاحب سے اسے سننے کا شرف حاصل ہوا، اور پھر گویا وہ ہمیشہ کے لیے میرے دل کی آواز بن گیا۔ اس کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

وطن سے لندن کو جانے والو! نصیب اپنا جگانے والو!
مرے غریب الدیار آقا کو جھک کے میرا سلام کہنا
سلام کہنا، سلام کہہ کر انھیں بصد احترام کہنا
کہ خوں کے آنسو رلا گیا ہے، تر اوہ شیریں کلام کہنا
وطن میں تیرے بغیر گلشن کی ڈالی ڈالی تڑپ رہی ہے
اداسیوں کے مہیب سائے ہیں چھا رہے صبح و شام کہنا
بڑا اذیت رساں ہے آقا تیری جدائی کا لمحہ لمحہ
ترس رہے ہیں تری زیارت کو میرے آقا عوام کہنا
تمھاری راہوں میں میرے آقا ہماری آنکھیں بچھی ہوئی ہیں
خدا کرے آپ جلد لوٹیں یہاں بصد احتشام کہنا

تری محبت، تری عقیدت کی شمعیں روشن ہیں میرے دل میں
دعا کریں کہ خدا میری چاہتوں کو بخشے دوام کہنا
نہیں مجالِ سخن اگرچہ یہ حوصلہ ہے دلِ حزیں کا
وگرنہ احسنؔ تو ہے فقط تیری جوتیوں کا غلام کہنا

اس کلام کا درد سینے میں سمیٹے میری بے قراریاں بڑھتی گئیں اور بالآخر خدائے کریم و قدوس نے وہ دن دکھایا جب ۱۹۸۹ میں آقا کے قدموں میں حاضر ہو کر انھیں قرار مل گیا۔ محبوب کے سینے سے لپٹ کر گویا صدیوں کی کلفتیں دور ہو گئیں۔ ہزاروں میل مسافت کی تھکنیں اور کوفتیں یکبارگی تمام ہوئیں۔ ہر دکھ، ہر غم بھول گیا۔ ہر کرب راحتِ جاں کے سرور میں بدل گیا۔ ہر درد کیفِ ماضیٰ کا روپ دھار گیا۔

——مگر اب سالوں بعد بزرگ صدیقی کی موت نے اس ہلکی سی کسک کو ایک بار پھر نمایاں کر دیا۔ اس معمولی سی چبھن کو واضح کر دیا، جو پھانس کی طرح میرے سینے میں پیوست رہی۔ وہ وجود جس کی صحبت نے عشق کی راہوں میں میرے آتشِ شوق کو بھڑکایا، جس کے کلام نے میرے ذوق و جنوں کو نکھارا۔ جس کی تڑپ اور تمنائیں میرے لیے راہِ منزل بن گئیں۔ جس کے صبر و قرار نے میری بے قراریوں کو اتنا بڑھایا کہ قفس کے بندھنوں کو توڑتا ہوا نُچے ہوئے پروں سمیت دیوانہ وار محوِ پرواز محبوب کے قدموں میں جا گرا—— خدا جانے اس سبیلِ سفر کی آنکھیں بھی آقا کے دیدار سے ٹھنڈی ہوئیں یا نہیں۔ اس کے سلگتے ہوئے سینے کو بھی محبوب سے لپٹ کر قرار نصیب ہوا کہ نہیں۔

——یہ سوچ کر میرے جذبات کی باگیں کھنچ سی گئیں۔ کیف و سرور کے لمحات پھیکے پڑنے لگے۔ جوش و جنوں کی چنگاریاں راکھ کا ڈھیر بننے لگیں۔ اپنی کامیابی پر نازاں ہونے کے بجائے شرمندہ سا ہونے لگا۔ اس خیال نے میرے شوقِ پرواز پر مَنوں بوجھ ڈال دیا—— منزل کی تلاش میں کتنے کارواں نکلتے ہیں، کتنے مسافر رختِ سفر باندھتے ہیں؟ —— مگر کتنے مراد پاتے ہیں؟ —— کچھ گردِ راہ ہو جاتے ہیں، کچھ مہمیز سفر بن جاتے ہیں۔ تھوڑے ہی منزل کو پہنچتے ہیں—— مگر ان پہنچنے والوں کے جلو میں پیچھے رہ جانے والوں کی قربانیوں کی لڑی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

سیّد احسن اسمٰعیل صدیقی صاحب کا وجود بھی قربانیوں کی اسی لڑی کے قیام کی یاد دلاتا رہے گا۔ ❁

انگریزوں کا وطیرہ ہے کہ وہ کسی عمارت کو اس وقت تک خاطر میں نہیں لاتے جب تک وہ کھنڈر نہ ہو جائے۔ اسی طرح ہمارے ہاں بعض محتاط حضرات کسی کے حق میں کلمۂ خیر کہنا روا نہیں سمجھتے تاوقتیکہ ممدُوح کا چہلم نہ ہو جائے۔ آغا کو بھی ماضی بعید سے، خواہ اپنا ہو یا پرایا، والہانہ وابستگی تھی۔ جس کا ایک ثبوت ان کی 1927ء ماڈل کی فورڈ کار تھی جو انھوں نے 1955ء میں ایک ضعیف العمر پارسی سے تقریباً مفت لی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ چلتی بھی تھی اور وہ بھی اِس میانہ روی کے ساتھ محلّے کے لونڈے ٹھلوے جب اور جہاں چاہتے چلتی گاڑی میں کُود کر بیٹھ جاتے۔ آغا نے کبھی تعرّض نہیں کیا۔ کیونکہ اگلے چوراہے پر جب یہ دھکڑ دھکڑ کر کے دم توڑ دیتی تو یہی سواریاں دھکّے لگا لگا کر منزلِ مقصود تک پہنچا آتیں۔ اس صورت میں پٹرول کی بچت تو خیر تھی ہی، لیکن بڑا فائدہ یہ تھا کہ انجن بند ہو جانے کے سبب کار زیادہ تیز چلتی تھی۔ واقعی اس کار کا چلنا اور چلانا معجزہ فن سے کم نہ تھا اس لیے کہ اس میں پٹرول سے زیادہ خون جلتا تھا۔ آغا دل ہی دِل میں کُڑھتے اور اپنے مصنُوعی دانت پیس کر رہ جاتے۔ لیکن کوئی یہ کار ہدیتاً لینے کے لیے بھی رضامند نہ ہوتا۔ کئی مرتبہ تو ایسا ہُوا کہ تنگ آ کر آغا کار کو شہر سے دُور کسی پیپل کے نیچے کھڑا کر کے راتوں رات بھاگ آئے۔ لیکن ہر مرتبہ پولیس نے کار سرکاری خرچ پر ٹھیل ٹھال کر آغا کے گھر بحفاظت تمام پہنچا دی۔

غرضیکہ، اس کار کو علیٰحدہ کرنا اتنا ہی دُشوار نِکلا جتنا اس کو رکھنا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اِس سے بہت سے تاریخی حادثوں کی یادیں وابستہ تھیں جن میں آغا بے عزّتی سے بری ہُوئے تھے۔ انجام کار، ایک سُہانی صبح فورڈ کمپنی والوں نے اُن کو پیغام بھیجا کہ یہ کار ہمیں لوٹا دو۔ ہم اس کو پبلسٹی کے لیے اپنے قدیم ماڈلوں کے میوزیم میں رکھیں گے اور اس کے بدلے سالِ رواں کے ماڈل کی بڑی کار تمہیں پیش کریں گے۔ شہر کے ہر کافی ہاؤس میں آغا کی خوش نصیبی اور کمپنی کی فیاضی کے چرچے ہونے لگے۔ اور یہ چرچے اُس وقت ختم ہُوئے جب آغا نے اس پیش کش کو حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا۔

کہنے لگے "دولُوں گا!"

کمپنی خاموش ہوگئی اور آغا عُمر بھر اس کے مقامی کارندوں کی نااہلی اور ناعاقبت اندیشی پر افسوس کرتے رہے۔ کہتے تھے "لالچی کہیں کی! پانچ سال بعد تین دینی پڑیں گی! دیکھ لینا!"

(مشتاق یوسفی کی "چراغ تلے" سے اقتباس)

مالا کی ایک شام۔ مظہر عارفی کے نام

رپورٹ: عبد الوحید

میں جب بھی اس کی محبتوں کی صداقتوں کی کتاب لکھوں
تو سب سے پہلے اسے محمّد کہوں رسالت مآب لکھوں
دل و نظر اشک اشک دھووں تو اس پہ بھیجوں درود مظہر
سجاؤں پلکوں کو آنسوؤں سے تو نعت کو آب آب لکھوں

پروفیسر چوہدری محمّد علی مظہر صاحب نے ہمہ جہت شاعری کی ہے مگر درج بالا دو اشعار آپ کے میلان طبع اور فطری رجحان کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔

مالا کے نام سے جماعت کے ادبی ذوق رکھنے والے افراد بخوبی واقف ہیں۔ یہ ادب نواز تنظیم جہاں گذشتہ کئی سالوں سے جماعت کے سالانہ جلسوں کے موقع پر محافل سخن بپا کرتی چلی آرہی ہے وہیں ڈی سی، میری لینڈ و ورجینیا میں مقیم ادبی ذوق رکھنے والوں بالخصوص اردو و پنجابی ادب کے چاہنے والوں کی تشنگی دور کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً دیگر ادبی نشستوں کا اہتمام بھی کرتی رہتی ہے۔ مالا سے وابستہ افراد اور خاص کر چوہدری صاحب کے چاہنے والوں کی کافی عرصے سے یہ خواہش تھی کے ان کے حوالے سے ایک شام منائی جائے جس میں آپ کی ادبی شخصیت اور خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے

بالاخر جماعت احمدیہ امریکہ کے نائب امیر ظہیر احمد باجوہ صاحب کی حسب خواہش جناب پروفیسر محمّد علی مظہر کی تدریسی، علمی اور ادبی کاوشوں اور خدمات کے اعتراف میں مالا کے تعاون سے مسجد بیت الرحمان کے انصار اللہ ہال میں مورخہ بارہ نومبر ۲۰۱۰ء کو اس پروقار شام کا اہتمام کیا گیا۔ اس نشست میں پروفیسر صاحب کے پرجوش شاگردوں اور مداحوں نے دور دور سے تشریف لا کر ان سے اپنی محبّت اور عقیدت کا ثبوت دیا۔

یہ نشست بعد نماز مغرب وعشاء اور کھانا تناول کرنے کے بعد شروع ہوئی۔ اس موقع پر انصار اللہ ہال کو خوبصورتی اور نفاست سے سجایا گیا تھا نیز اسٹیج کو روایتی مشاعروں کی طرز پر چاندنی اور گاؤ تکیوں سے مزین کیا گیا تھا۔ تقریب کی نظامت کے لیے جو شیلے شاعر جناب احمد مبارک خاص طور پر نیو یارک سے تشریف لائے تھے۔ جناب احمد مبارک کے علاوہ اس نشت میں ربوہ سے تشریف لائے پروفیسر صاحب کے محبوب شاگرد میجر (ر) شاہد سعدی بھی موجود تھے جنہوں نے مختصراً آپ کے ساتھ گزرے وقت کا بڑی محبت سے ذکر کیا۔ ان کے علاوہ ٹورانٹو کینیڈا سے مکرم چوہدری صاحب کے ایک اور ہونہار طالب علم اور باسکٹ بال کے

حوالے سے لاڈلے کھلاڑی سجاد ملک صاحب بھی شامل تقریب تھے۔ تقریب کا آغاز حفیظ خان صاحب نے تلاوت کلام پاک سے کیا- اس کے بعد محترم نائب امیر صاحب نے مختصر تعارفی کلمات کے ذریعے حاضرین کی خدمت میں پروفیسر صاحب سے متعلق اپنی ربوہ کی یادیں پیش کیں-

تعارفی کلمات کے بعد منصور احمد اور بلال راجہ نے پروفیسر صاحب کا چنیدہ کلام نہایت خوش الحانی سے پڑھ کر حاضرین کو سنایا-

ڈاکٹر خالد عطاء نے حضرت خلیفۃ المسیح رابعؒ کے چوہدری صاحب کے نام کچھ مکتوب پڑھ کر حاضرین کو سنائے- حضور آپ کو میر احمدؐ علی کہتے تھے- حضور چونکہ خود بلند پایہ ادبی وشعری ذوق رکھتے تھے لہٰذا حضور کا پروفیسر صاحب کے بارے میں یہ کہنا کہ " ایک وقت میں ایک سے زیادہ محمدؐ علی پیدا نہیں ہوا کرتے " آپ کے لیے نہ صرف باعث افتخار ہے بلکہ ایک سند کا درجہ رکھتا ہے-

اور نیز حضور نے ایک مکتوب میں یہ بھی فرمایا کے " آپکی ہر غزل پر ایک خط لکھوں تب بھی حق ادا نہ ہو سکے گا"

چوہدری صاحب کی خلافت احمدیہ اور حضرت خلیفہ رابع رحمہ اللہ سے محبت و عقیدت ذیل کے اس شعر سے بخوبی عیاں ہے-

کبھی تو اس سے ملاقات ہوگی جلسے پر
کبھی تو وہ آئے گا وصل کے مہینوں میں

احمد مبارک صاحب نے بتایا کہ حضرت خلیفۃ المسیح خامس ایدہ اللہ نے چوہدری صاحب کہ نام اپنے پچیس مئی ۲۰۰۶ کے مکتوب میں آپ کے مجموعہ کلام کا نام " اشکوں کے چراغ" تجویز فرمایا تھا-

ناصر جمیل صاحب نے چوہدری صاحب کے بارے میں محترم پرویز پروازی صاحب کا مضمون پڑھ کر سنایا-

چوہدری صاحب کے بارے میں اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک مضمون آپ کے شاگرد ناصر راجہ صاحب نے پڑھ کر سنایا-- آپ نے بتایا کہ کیسے اور کن حالات میں آپنے پہلے حضرت مصلح موعودؓ اور پھر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے ادوار میں تعلیم السلام کالج میں پہلے قادیان، لاہور اور پھر ربوہ میں تدریس کے فرائض نہایت ایمانداری اور لگن سے انجام دیے کالج کے لیے آپ کی طویل مدت پر پھیلی خدمات کے باعث کالج کی تاریخ آپ کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے-- بقول آپ کے محمدؐ علی مضطر عارفی ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک عہد کا نام ہے- آپ دھیمے اور نرم خو انسان، شفیق استاد اور باکمال شاعر ہیں۔

شب کے تقریباً ساڑھے دس بجے چوہدری صاحب سے پاکستان میں فون پر رابطہ کیا گیا تا کہ آپ کہ شاگرد آپ کی کچھ باتیں ان کی زبانی سن سکیں- یہ حیران کن امر ہے کے پروفیسر صاحب جو کہ اپنی عمر عزیز کی ماشاءاللہ ۹۳ بہاریں دیکھ چکے ہیں نے اس پیرانہ سالی کے باوجود نہ صرف کافی دیر تک حاضرین سے فون پر مخاطب رہے بلکہ فرداً فرداً اپنے شاگردوں کے احوال بھی پوچھتے رہے- اپنے شاگردوں کی خواہش پر پروفیسر صاحب نے اپنے کلام کے کچھ حصّے پڑھ کر سنائے-

چوہدری صاحب سے باتوں کے دوران ان کے شاگردوں کا جوش دیدنی تھا جو ایک کے بعد ایک ان سے فون پر باتیں کرتے اور فرمائشیں کیے جا رہے تھے- اس یادگار ادبی شام کا اختتام رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے چوہدری صاحب کی پرسوز دعا سے ہوا- ذیل میں محترم چوہدری صاحب کے کلام میں سے چند نمونے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں-

زمین کا زخم بھی اب بھر رہا ہے
نہ دلّی ہے نہ امرتسر رہا ہے
رہا ہے تو ہمارے قتل کے بعد
تمہارا ذکر ہی اب چل رہا ہے

چاند نگر کے چشمے خون اگلتے ہیں
دریا سوکھ گئے ہیں ساحل جلتے ہیں
جاگنے والے اشکوں کی آواز نہ سن
آنکھ کے سورج ڈھلتے ڈھلتے ڈھلتے ہیں

اشک چشم تر میں رہنے دیجیے
گھر کی دولت گھر میں رہنے دیجیے
آپ مضطر، جائیے لیکن ہمیں
کوچۂ دلبر میں رہنے دیجیے

مجھ کو مرے روبرو نہ کرنا
اتنا بے آبرو نہ کرنا

پہچان نہ سکو گے چہرے
آئینوں کی آرزو نہ کرنا

میں اپنی ذات سے آگے سفر پر کیا جاتا
کہ اس جزیرے کے چاروں طرف کنارہ تھا
شب وصل میں فرقت کے فاصلے نہ گیے
کہ وصل یار بھی فرقت کا استعارہ تھا

میرے اندر لڑائی ہو رہی ہے
میری مجھ سے جدائی ہو رہی ہے
خدا خوش ہو رہا ہے آسمان پر
خفا ساری خدائی ہو رہی ہے

جاگ اے شرمسار آدھی رات
اپنی بگڑی سنوار آدھی رات
یہ گھڑی پھر نہ ہاتھ آئے گی
باخبر ہوشیار، آدھی رات
وہ جو بستا ہے ذرے ذرے میں
کبھی اس کو پکار آدھی رات
کھلتے کھلتے کھلے گا باب قبول
عرض کر بار بار آدھی رات
کس لیے بیقرار ہے مضطر
کس کا ہے انتظار آدھی رات

میں سورج اڈّھی رات دا میرے برفاں چار چو فیر
میری اگ تے اگّے بجھ گئی میرا نور نہ میتھوں کھو

تاریاں ہیٹھ کھلو کے کل مضطر اڈّھی رات
جد کھڑکی کھولی وقت دی آئی صدیاں دی خشبو

❁

ہمارا کالج

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کی نظر میں

''میرے نوجوان دوستو! آپ کی تیسری خوش بختی یہ ہے کہ آپ نے جس ادارے میں تعلیم پائی ہے وہ دُنیا میں دین کے امتزاج کا ایک نہایت متوازن تصوّر پیش کرتا ہے۔ نہ صرف پیش کرتا ہے بلکہ اسے عملِ مسلسل میں ملبوس بھی کرتا چلا جاتا ہے۔ خدا وہ دن جلد لائے جب ہم اِس کالج کو ایک معیاری، مکمل اور منفرد کلّیہ کی حیثیت و صورت میں دیکھ سکیں اور کوئی وجہ نہیں کہ جہاں کام کو کام نہیں بلکہ ایک مشن تصوّر کیا جاتا ہے، جہاں طلبہ کو صرف پڑھایا نہیں جاتا بلکہ اُن کے مزاجوں میں ایک کوہ شکن سنجیدگی اور کردار میں ایک شریفانہ صلاحیت پیدا کی جاتی ہے اور جہاں اساتذہ کی قربانیاں اور جانفشانیاں اپنے پیچھے ایک کہکشانِ نور چھوڑتی چلی جاتی ہیں وہاں اہلِ خیر کی تمنّائیں کیوں فروغ نہ پائیں گی اور اہلِ علم کے عزائم کیوں نہ پورے ہونگے۔''

(خطبۂ صدارت بر موقع جلسہ تقسیم اسناد و انعامات ۱۹۶۳ء)

مُضطر عارفی

نعرہ زن بزم میں جب تو ہو گا
کس کو جذبات پہ قابو ہو گا
زیست کی کوئی تو صورت ہو گی
چین کا کوئی تو پہلو ہو گا
رات بھر سیر چراغاں ہو گی
کہیں جگنو کہیں آنسو ہو گا
ہم چلے جائیں گے اُٹھ کر تنہا
یہ بھی فریاد کا پہلو ہو گا
چاند نکلے گا کہ تم آؤ گے
فیصلہ اس کا لبِ جو ہو گا
دم بخود جس سے ہے شہر مسحور
وہ تری آنکھ کا جادو ہو گا
قیس تنہائی سے ڈرتا کیوں ہے
دشت میں کوئی تو آہو ہو گا
کس کو حاصل ہے دوام اے ساقی
ہم نہیں ہونگے تو کیا تُو ہو گا
جس نے گرتوں کو سنبھالا مُضطر
وہ مرے یار کا بازو ہو گا

(المنار۔اپریل۔مئی۔جون 1962)

نصیر احمد خان نصیر

اُبھر رہے ہیں تصور میں پھر وہی خد و خال
رواں ہے پھر اُس منزل کو کاروانِ خیال
شباب و شعر کی رُت گُدگدا گئی دل کو
خیال یار ہے گویا خرام بادِ شمال
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ مہر و ماہ تمام
کسی کے نور کا پرتو کسی کے رُخ کا جمال
یہ جُستجو کہ جسے ہم حیات کہتے ہیں
ازل اُٹھان ہے اسکی ابد ہے اسکا کمال
ہمارا ذوقِ طلب احتیاج دیدہ و دل
تمہارا لطف و کرم بندہ پروری پر دال
چمن میں تُو گُل و بُلبُل کی داستاں مت چھیڑ
تمام عشق خرابی تمام حُسن زوال
جھٹک کے ناز سے دامن چھڑانے والے سُن
کسی کے شیشۂ دل میں نہ آگیا ہو بال
جواب یہ ہے کہ اس کا جواب کیا ہو گا
سوال یہ ہے کہ کیوں لب پہ آگیا ہے سوال
ہجوم اشک سے بحر الم تلاطم خیز
وفور غم سے زمیں دل کی زلزلت زلزال
بجھی بجھی سی تمنا مٹا مٹا سا ئر اب
یہ کائنات ہے دل کی وہ ہے نظر کا کمال
یہی ہے دنیا میں امن و سلامتی کی روش
کہ کُل جہان سے نیکی کر اور کنویں میں ڈال
دلِ نصیر پہ ٹوٹے ہیں کوہِ غم کیا کیا
یہ سر گزشت ہے اپنی نہ اس میں قیل نہ قال

(المنار۔اپریل۔مئی۔جون 1962)

پرویز پروازی

اجنبی

اِک زمانہ ہوا
ایک گمنام سی
راہ کے موڑ پر
دو مسافر ملے!
چند لمحے رُکے
اور پھر چل دیئے
اجنبی ہو گئے

ان کے دل میں مگر
ایک بے نام سی
آرزو کی کلی
کھل اُٹھی!
بات کچھ بھی نہ تھی
اِک فسانہ ہوا
اِک زمانہ ہوا

(المنار، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳)

بشارت جمیل

"مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد"
ہے اب بھی مگر تیرے تبسّم کی ادا یاد

وہ سیلِ تمنا ہے نہ وہ شورِ تلاطم
دل کو ہے مگر شورِ تلاطم کی صدا یاد

مجبورِ محبت کو ہر اک راہ گزر سے
آتی ہے کسی عہدِ گذشتہ کی صدا یاد

وہ واعظِ بے دیں ہے یہ واعظِ دیندار
اُس کو ہے خُدا یاد نہ اس کو ہے خُدا یاد

منزل بھی کٹھن راہ بھی دشوار تھی لیکن
صد شکر کہ مشکل میں بھی تو ہم کو رہا یاد

ہے طالعِ تقدیر ہی گردش میں جمیل آج
ہے اپنی وفا یاد نہ ہے تیری وفا یاد

(المنار، جنوری-فروری، ۱۹۶۴ء)

عبدالشکور، کلیو لینڈ، اوہائیو

کوفۂ بے وفا

ایک مچھر بچھونے کی شِکنوں کے اندر پڑا،
ادھ موا ہو گیا تھا
وہ پی کر لہو تیرا میرا، وہیں سو گیا تھا
اِک حسین خواب میں کھو گیا تھا

ساعتیں وعدہء نو بہاری کی قرنوں میں ڈھلتی رہیں
وقت کی دُھند میں راہ بدلتی رہیں
اور گُم ہو گئیں

نقشِ نو قرضِ ماضی کے بدلے میں لایا گیا
اِک نئے طشت میں وہ سجایا گیا
جس کی چمکار سے، دیدہءِ کور خیرہ ہوئی
آنکھ حیراں ہوئی دیکھتی ہی رہی

قافلہ ایک ترتیب پانے لگا
جِس میں شامل ہوئے شہسواروں کی مانند کُچھ لوگ
اپنے چہروں پہ رنگیں نقابیں سجائے ہوئے
رُوسیاہی کو اپنی چھُپائے ہوئے

دعوٰیءِ عشق مٹی پہ لِکھا گیا
دیکھتے دیکھتے میری دھرتی کی آغوش وا ہو گئی
آخرش اِس کے اپنے ہی فرزند تھے
اِس کے دِلبند تھے

تُخم پھر 'نخلِ وعدہ' کا بویا گیا
آبِ حرص و ہوا سے وہ سینچا گیا
یہ زمیں چُپ رہی، آسماں چُپ رہا
کیا غضب ہو رہا!
کُوفہءِ بے وفا، کربلا کربلا
میرا گھر، میرا گُلشن، یہ سیلِ بلا
میرے لوگو، مقامِ سکوت و دُعا!!

ہدایت اللہ ہادیؔ

رشتۂ دوام

سُنا ہے آمادۂ وفا ہو!
سُنا ہے تجدیدِ ساعتِ رفتہ چاہتے ہو!
میں کیسے ناکامئ تمنّا کو بھول جاؤں؟

تری ندامت کا بوجھ بھی اب اُٹھا رہا ہوں
خلش ہے دل میں
مگر میں خوش ہوں۔۔۔ میں مطمئن ہوں
کہ تیرے دل سے قریب تر ہوں!

جو دیپ روشن ہے کُنجِ تنہائی میں
اسے بھی! میں نے!
جگر کے خون سے کیا ہے روشن!
مرے سلگتے ہوئے آنسوؤں کی شبنم
میری نگاہوں سے ہے گریزاں!!
میں تشنۂ آرزو وہ اچھا
کہ آرزو کی بقا یہی ہے۔

(المنار، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳)

نعیم قدسی

"زخمی یاد"

1

راستے اجنبی سے لگتے ہیں
راستے جن پہ مدتوں ہم نے
فکر تعمیرِ نوجہاں کی تھی
راستے جن کی تیرہ بختی کو
تیرے عارض کی جگمگاہٹ نے
رنگ بخشا تھا روشنی دی تھی
راستے جن پہ ہم نے پہلی بار
ان روایات کے ستونوں کی
کہنہ زنجیر توڑ ڈالی تھی

2

راستے جن پہ چلتے چلتے ہم
پیار کی مملکت میں پہنچے تھے
مملکت وہ کہ جس میں ہم دونوں
مطلق الحکم تھے شہنشاہ تھے

3

اب اُن راستوں پہ تنہا ہوں
اب نہ تو ہے، نہ تیری آہٹ ہے

(المنار، جولائی تا ستمبر، ۱۹۶۲ء)

شیخ اظہر سلیم سلیمیؔ

حالِ دِل

اُمیدوں کو جب ایک ٹھوکر لگی
خیالوں کے عقدے اُلجھنے لگے

تصور کی دنیا میں ہلچل مچی
کہانی، ہر اک بات بنتی گئی
سحر ایک اُبھری مرے ذہن سے
اُبھرتی رہی رات بنتی گئی
شگوفے کِھلے کِھل کے مُرجھا گئے
بہار آئی آفات بنتی گئی
اندھیرا اُجالوں کو کھانے لگا
مری جیت بھی مات بنتی گئی
جسے چاہا نوچوں خیالات سے
وہ تصویر بالذات بنتی گئی

غمِ دل کا لاوا اُبلتا رہا
ترے پیار کا دیپ جلتا رہا

(المنار، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳)

Who Are Muslim Americans?

(Safir Rammah)

Muslim Americans

HIGHLIGHTS FROM
A PEW RESEARCH CENTER
SURVEY REPORT

A 63% majority of Muslim Americans are first generation immigrants to the U.S., with 45% having arrived in the U.S. since 1990. More than a third of Muslim Americans (37%) were born in the U.S., including 15% who had at least one immigrant parent. Despite the sizable percentage of immigrants, 81% of Muslim Americans are citizens of the U.S., including 70% of those born outside the U.S. This is a much higher rate of citizenship among foreign born Muslims than among the broader immigrant population in the U.S.; 47% of all foreign-born are citizens.

First-generation Muslim Americans come from a wide range of countries around the world. About four-in-ten (41%) are immigrants from the Middle East or North Africa, while about a quarter (26%) come from South Asian nations including Pakistan (14%), Bangladesh (5%)and India (3%). Others came to the U.S. from sub-Saharan Africa (11%), various countries in Europe (7%), Iran (5%), or other countries (9%).

Among the roughly one-in-five Muslim Americans whose parents also were born in the U.S., 59% are African Americans, including a sizable majority who have converted to Islam (69%). Overall, 13% of U.S. Muslims are African Americans whose parents were born in the United States.

A 55% majority of Muslim Americans are married, comparable to 54% among the U.S. general public. Most Muslim Americans (83%) are married to someone of their own faith, as is the case generally in the U.S. For example, among married U.S. Christians, 92% are married to a Christian.

SECTION 1: A DEMOGRAPHIC PORTRAIT OF MUSLIM AMERICANS

Muslim Americans are a heavily

immigrant population. Of those age 18 and older, more than six-in-ten (63%) were born abroad, and many are relative newcomers to the United States: Fully one-quarter of all U.S. Muslim adults (25%) have arrived in this country since2000. The Muslim American population also is significantly younger and more racially diverse than the public as a whole. Muslim Americans are just as likely as other Americans to have a college degree, but fewer report having more than a high school education. Financially, the recent recession appears to have taken a toll on this young, largely immigrant population. The percentage of U.S. Muslims who say they own their homes has slipped since 2007, and the portion at the bottom of the income ladder has grown; 45%of Muslim Americans now report having total household income of less than $30,000 a year, compared with 36% of the general public.

Diverse Origins

More than a third of Muslim American adults(37%) were born in the United States. But more than three-quarters are either first generation immigrants (63%) or second generation Americans (15%), with one or both parents born outside of the country. About one-in-five (22%) belong to a third, fourth or a later generation of Americans. Foreign-born Muslim Americans are very diverse in their origins. They have come from at least 77 different countries, with no single country accounting for more than one-in six Muslim immigrants. Pakistan is the largest country of origin, accounting for 14% of first-generation immigrants, or 9% of all U.S. Muslims.

In terms of regional origins, however, the largest group is from Arab countries in the Middle East and North Africa, representing 41% of foreign-born U.S. Muslims, or 26% of all Muslim Americans. The South Asian region – including Pakistan, India, Bangladesh and Afghanistan – is second, accounting for about a quarter (26%) of first-generation immigrants, or 16% of all U.S. Muslims. The rest are from sub-Saharan Africa, Europe and elsewhere.

In contrast to the origins of U.S. Muslims, the global distribution of Muslims is somewhat different. Asia has the highest concentration of the global Muslim population, with Indonesia contributing the largest numbers, and Pakistan and India second and third respectively. (*For a detailed look at the worldwide distribution of the Muslim population, see this analysis from the Pew Forum on Religion & Public Life; "The Future of the Global Muslim Population: Projections for 2010-2030," released Jan. 27, 2011*).

Most of the foreign-born Muslims came to the United States after 2000 (40%) or during the 1990s (31%). An additional 16% arrived in the 1980s. Just 12%

	U.S. Muslims	Foreign born
	%	%
United States	37	--
Middle East/N. Africa	26	41
Pakistan	9	14
Other South Asia	7	12
Iran	3	5
Sub-Saharan Africa	7	11
Europe	5	7
Other	6	10
	100	100
Year of arrival		
2011-2000	25	40
1999-1990	20	31
1989-1980	10	16
1979 **and earlier**	8	12
Native born	37	--
U.S. Citizen		
Yes	81	70
No	19	30

arrived before 1980.

Despite the high proportion of immigrants in the Muslim American population, the vast majority (81%) report that they are U.S. citizens. Besides the 37% who are citizens by birth, 70% of those born outside the United States report that they are now naturalized citizens. The high rate of naturalization is even more apparent when citizenship is compared with year of arrival. Of those who arrived before 1980, virtually all (more than 99%) have become U.S. citizens. Of those who arrived in the 1980s, 95% are now citizens. Of those who arrived in the 1990s, 80% are citizens. And of those who arrived after 2000, 42% already have become citizens. Since it typically takes three to five years to become eligible for citizenship, many of the more recent arrivals have not been in the country long enough to apply.

Race and Ethnicity

Muslim Americans are racially diverse. No single racial or ethnic group makes up more than 30% of the total. Overall, 30% describe themselves as white, 23% as black, 21% as Asian, 6% as Hispanic and 19% as other or mixed race.

Racial breakdowns vary considerably among foreign-born Muslims from different regions. More than eight-in-ten U.S. Muslims from the Middle East and North Africa region describe themselves as either white (60%) or other/mixed race (22%). By contrast, 91% of Pakistanis and 69% of those from other South Asian nations describe their race as Asian.

The native-born Muslim population contains a higher proportion of blacks, and lower proportions of whites and Asians, than the foreign-born population. Among native-born Muslims, 40% describe themselves as black, while 18% identify as white, 10% as Asian and 10% as Hispanic; 21% say they are of some other race or are mixed race. Among foreign-born Muslims, a majority describe themselves as either white (38%) or Asian(28%), while 14% describe themselves as black, 16% as other/mixed race and 4% as Hispanic. The concentration of blacks is especially high (59%) among third generation Muslims (those who were born in the U.S. of U.S.-born parents).

The percentage of Muslims who have graduated from college (26%) is about the same as among all U.S. adults (28%). At the other end of the educational spectrum, there also is no significant difference in the proportion who failed to finish high school (14% of U.S.

Muslims, 13% of the general public). Muslim Americans – particularly those born in the United States – are more likely than American as a whole to have only graduated from high school. But a very high percentage (26%) says they are currently enrolled in college or university classes (compared with 13% among the general public).

U.S. Muslims are about as likely to report household incomes of $100,000 or more as are other Americans (14% of Muslims, compared with 16% of all adults). But differences emerge in the middle of the scale: 40% of Muslim Americans report family incomes between $30,000 and $100,000, compared with 48% of the general public. And a higher percentage of Muslim Americans than the general public report that their annual household earnings are less than $30,000 (45% among Muslims,36% among the general public).

The current income pattern represents something of a decline for Muslim Americans from four years ago, prior to the economic recession. In the 2007 survey, Muslims generally mirrored the U.S. population in household income at all levels. At that time, roughly a third of both Muslim Americans(35%) and the general public (33%) reported earning under $30,000 a year. One possible explanation for the deterioration may be that the bursting of the housing market bubble in 2006 and the recession that followed from late

2007 to mid-2009 disproportionately affected the young, largely immigrant and racially diverse Muslim American population, much as the sub-prime mortgage crisis and the recession hurt blacks and Hispanics more than it did the general public.1One-third of U.S. Muslims (33%) now report that they own their homes, compared with58% of the public. Both figures have declined since 2007. The homeownership rate among Muslims is down 8 percentage points, from 41% four years ago, mirroring the 10-point drop (from 68% in 2007) among all adults nationwide. Declines in home ownership occurred among both native-born and foreign-born Muslims.

Number of Muslims in the U.S.

Based on data from the survey, in combination with U.S. Census data, Pew Research Center demographers estimate that there are about 1.8 million Muslim adults and 2.75million Muslims of all ages (including children under 18) living in the United States in2011. This represents an increase of roughly 300,000 adults and 100,000 Muslim children since 2007, when Pew Research demographers used similar methods to calculate that there were about 1.5 million Muslim adults (and 2.35 million Muslims of all ages) in the U.S. The increase is in line with what one would expect from net immigration and natural population growth (births minus deaths) over the past four years. The 2011 population estimate also roughly accords with separate projections made last year by the Pew Forum's "The Future of the Global Muslim Population." For that report, demographers at the International Institute for Applied Systems Analysis (IIASA) in Austria independently estimated the total U.S. Muslim population at about 2.6 million in 2010.The same report also estimated that about 80,000 to 90,000 new Muslim immigrants have been entering the United States annually in recent years.

How the estimate was made

Prior to Pew Research Center's 2007 survey, no estimate for the Muslim American population, based on widely accepted social scientific methods, was available. Gauging the number of Muslims living in the United States is difficult because the U.S. Census Bureau, as a matter of policy, does not ask Americans about their religion. Nor do U.S. immigration authorities keep track of the religious affiliation of new immigrants. Both the Census Bureau and immigration authorities do collect statistics, however, on people's country of birth. Researchers can estimate the size of U.S. religious groups by combining this country-of-birth information with data from surveys on the percentage of people from each country, or group of countries, who belong to various faiths.

For example, interviewing used to identify Muslim respondents for the Pew Research Center's 2011 Muslim American survey (which screened more than 43,000 households, including non-Muslims) finds that 87% of people living in the U.S. who were born in Pakistan, Bangladesh or Yemen are Muslim. Pew Research demographers applied this percentage to country-of-birth figures from the U.S. Census Bureau. The census data show there are 198,000 households in which the head or spouse is from one of these three countries, which when multiplied by the percentage of Muslims from these countries (87%) results in an estimate that there are 173,000 immigrant Muslim households of Pakistani, Bangladeshi and Yemeni extraction.

The survey also asked about other Muslim adults and children in the household. On the basis of this information, an average household size was calculated for each country-of birth group (or parent's country-of-birth group) and multiplied by the number of households. The 173,000 Muslim immigrant households from Pakistan, Bangladesh and Yemen, for example, contain an estimated 380,000 Muslim adults and 195,000 Muslim children, for a combined total of 576,000 Muslims in these households. A similar approach was taken for second-generation immigrant households, which were calculated separately. For households with no foreign-born respondents or natives with foreign born parents

(i.e., third-generation households), calculations were made using survey data on age and racial breakdowns of third-generation (or later) Muslim Americans, again applied to U.S. Census data on the third-and-higher generations.

SECTION 2: RELIGIOUS BELIEFS AND PRACTICES

Most Muslim Americans say religion is very important in their lives, two-thirds pray every day (including 48% who pray all five salah daily), and nearly half attend religious services at a mosque at least once a week. U.S. Muslims' religious beliefs tend to be highly orthodox; for example, 92% believe in the Day of Judgment and 90% believe in angels, both of which are traditional tenets of Islam. However, most Muslim Americans also say that there is more than one true way to interpret the teachings of Islam and that many religions, not just Islam, can lead to eternal salvation.

Islamic Affiliation and Converts to Islam

Most Muslims in the United States (65%) identify with Sunni Islam; just 11% identify with the Shia tradition. Roughly one-in-seven Muslims (15%) have no specific affiliation, describing themselves, for example, as "just a Muslim". Muslims who have no specific affiliation makeup a much larger share of the U.S.-born Muslim population than of the immigrant population. About one-in-four native-born Muslims (24%) have no specific affiliation, compared with just 10% of Muslims born in other countries.

Among American Muslims, 20% are converts to Islam, saying they have not always been Muslim. The Pew Forum's 2007 Religious Landscape Survey found that among the U.S. general population, an identical percentage(20%) currently belong to a major religious tradition different than the one in which they were raised. Among native-born Muslims whose parents also were born in the U.S., fully two-thirds(69%) say they are converts to Islam. And among African American Muslims who were born in the U.S., 63% are converts to the faith. The vast majority of Muslim Americans who are immigrants, or whose parents were immigrants, have always have been Muslim. Sunni and Shia Muslims have similar numbers of converts within their ranks (17% among Sunnis and 13% among Shia). Among Muslims with no specific affiliation, 36% say they are converts to Islam.

تعلیم الاسلام کالج المنائی ایسو سی ایشن یو۔ایس۔اے
تعلیمی وظائف کا اجراء

امسال جلسہ سالانہ امریکہ کے موقع پر تعلیم الاسلام کالج المنائی یو۔ایس۔اے کے سالانہ اجلاس پر تنظیم کی جانب سے پاکستان میں تعلیم حاصل کرنے والے احمدی طلباو طالبات کے لیے وظائف کی منظور کردہ تجویز نظارت تعلیم صدر انجمن احمدیہ ربوہ کی معرفت حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہٖ العزیز کی خدمت میں بھجوائی گئی گئی تھی۔

ہمارے لیے یہ بات باعث اعزاز ہے کہ حُضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے ازراہ شفقت ہماری پیش کش قبول فرما کر جن وظائف کی منظوری عطا فرمائی اُن کی تفصیل اور طریقہ کار نظارت تعلیم سے موصول ہونے والے خط میں درج ہے۔ اس خط کا عکس المنار کے شمارہ ہذا میں شامل اشاعت ہے۔

ایسو سی ایشن کے ممبران سے درخواست ہے کہ وہ سکالرشپ فنڈ میں اپنے سالانہ وعدہ جات اور حسب توفیق ادائیگی جلد از جلد سیکرٹری مال، محترم پرویز اسلم صاحب، کو درج ذیل پتہ پر روانہ کر دیں:

Perwaiz Aslam Chaudhry
1904 Carters Grove Dr
Silver Spring, MD 20904

Make you check payable to :
Ahmadiyya Movement in Islam
Memo: TICAA Scholarship Fund

تنظیم کے ارکان سے درخواست ہے کہ اس فنڈ میں خود بھی شامل ہوں اور شمولیت کے لیے اپنے عزیز واقارب اور دوستوں کو بھی توجہ دلائیں اور اس کارِ خیر میں حصہ لینے کی تحریک کریں۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اس تحریک میں برکت ڈالے اور ہماری آنے والی نسلوں کو تعلیم کے میدان میں اعلیٰ کامیابیوں سے نوازتا چلا جائے۔ آمین

ڈاکٹر صفی اللہ چوہدری
ایگزیکٹو ممبر، تعلیم الاسلام کالج المنائی، یو۔ایس۔اے

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

نمبر: 218
تاریخ: 12-09-13

نظارت تعلیم

صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ

مکرم و محترم صفی اللہ چوہدری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ آمین

آنمکرم نے تعلیم الاسلام کالج اولڈ ایسوسی ایشن۔ یو ایس اے سکالرشپ کی جانب سے مبلغ -/USD 15,000 کی رقم نظارت تعلیم کے تحت سکالرشپس شروع کرنے کی خواہش اظہار کیا گیا۔ جس پر نظارت تعلیم نے آپ کی درخواست کو حضور انور کی خدمت اقدس میں پیش کیا جو کہ ازراہ شفقت حضور انور نے مندرجہ ذیل صورت میں منظور فرمائی ہے۔

آپ کی خواہش کے مطابق سکالرشپ کیلئے مختص کی گئی رقم کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کا آغاز سال 2013ء سے ہوگا۔ ان کی تفصیل ذیل ہے۔

1. تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن۔ یو ایس اے تعلیمی قرض فنڈ (USD 7,500/-)
2. تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن۔ یو ایس اے انعامی سکالرشپس (USD 7,500/-)

1. تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن۔ یو ایس اے تعلیمی قرض فنڈ

- اس فنڈ کیلئے تعلیم الاسلام کالج اولڈ ایسوسی ایشن۔ یو ایس اے ہر سال مبلغ -/USD 7,5000 ادا کرے گی۔
- اس فنڈ سے مستحق اور ذہین طلباء و طالبات کو ان کی تعلیم کیلئے مالی مدد کی جائے گی۔
- کسی طالبعلم یا طالبہ کو کسی پروفیشنل ڈگری یا کورس میں داخلہ حاصل کرنے پر حسب ضرورت اس کو رقم دی جائے گی۔
- یہ رقم ایک بار یا بالاقساط تعلیم کے مکمل ہونے تک اس طالبعلم / طالبہ کو دی جائے گی۔
- تعلیم مکمل ہونے کے تین سے چھ سال کے عرصہ میں اس فنڈ سے مستفید ہونے والا طالبعلم / طالبہ حاصل کردہ رقم اس فنڈ میں جمع کروائے گا جس سے یہ فنڈ بڑھتا رہے گا اور مزید طلبہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

2. تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن۔ یو ایس اے انعامی سکالرشپس

نظارت تعلیم کے تحت تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن۔ یو ایس اے کی طرف سے ذہین طلباء و طالبات کو ان کی اعلیٰ کارکردگی پر یہ سکالرشپ بطور انعام دیئے جائیں گے۔

ان سکالرشپس کو مختلف Categories میں تقسیم کیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

نمبر:
تاریخ:

نظارت تعلیم

صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ

- نظارت تعلیم کے تحت ربوہ کے تعلیمی اداروجات میں انٹر میڈیٹ میں پہلی دوسری اور تیسری پوزیشن پر آنے والے طالبعلم / طالبہ کو بالترتیب -/25,000روپے، -/15,000 روپے اور -/10,000روپے کی رقم بطور انعام دیئے جائیں گے۔
- نظارت تعلیم کے تحت سکولز میں اساتذہ کا اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے اور دوران ملازمت ایم فل یا ایم ایس تک کی تعلیم مکمل کرنے پر ان اساتذہ میں مبلغ -/1,00,000 روپے بطور انعام تقسیم کیے جائیں گے۔
- نظارت تعلیم کے تحت سکولز میں اساتذہ کا اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے اور دوران ملازمت پی ایچ ڈی تک کی تعلیم مکمل کرنے پر ان اساتذہ میں مبلغ -/1,50,000 روپے بطور انعام تقسیم کیے جائیں گے۔
- پاکستان سے کسی منظور شدہ یونیورسٹی سے بی ایس چار سالہ ڈگری (کسی بھی مضمون میں) مکمل کرنے پر پہلی تین پوزیشن پر آنے والے طالبعلم / طالبہ کو بالترتیب -/60,000روپے، -/50,000روپے اور -/40,000روپے بطور انعام دیئے جائیں گے۔
- پاکستان سے کسی منظور شدہ یونیورسٹی سے ایم فل یا ایم ایس (کسی بھی مضمون میں) مکمل کرنے پر پہلی تین دو پوزیشن پر آنے والے طالبعلم / طالبہ کو بالترتیب -/80,000 روپے اور -/70,000روپے بطور انعام دیئے جائیں گے۔
- پاکستان میں کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس یا انجینئرنگ (کسی بھی فیلڈ میں) کامیابی سے مکمل کرنے پر پہلی پوزیشن پر آنے والے طالبعلم کو -/75,000,-/75,000روپے بطور انعام دیئے جائیں گے۔

اس وقت نظارت تعلیم میں ایک کثیر تعداد میں ضرورت مند اور مستحق طلبا و طالبات (جو اپنی تعلیم کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے) کی درخواستیں موصول ہو رہی ہیں۔ اسی طرح نظارت تعلیم میں سال 2013 میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کی درخواستیں برائے انعامی سکالرشپ بھی موصول ہو رہی ہیں۔ ان درخواستوں کے مقرر کردہ تاریخ تک موصول ہونے کے بعد انعام کا فیصلہ میرٹ کی بنیاد پر سب سے زیادہ فی صد نمبر حاصل کرنے پر کیا جاتا ہے۔

آنمکرم سے درخواست ہے کہ تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن۔ یو ایس اے تعلیمی قرض فنڈ اور انعامی سکالرشپس کیلئے مختص کی گئی رقم مبلغ -/USD 15,000 بھجوا کر ممنون فرمائیں تا کہ بروقت انعامات کی تیاری کی جا سکے۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء

والسلام

خاکسار

ناظر تعلیم
13/9/2013

Quarterly
Vol 1, No 3, July—December 2013
ALMANAR
A scholarly and literary magazine of Talimul Islam College Alumni Association,